فوج کا سیاسی کردار
ذوالفقار علی بھٹو

فوج کا سیاسی کردار

ذوالفقار علی بھٹو

احمد پبلی کیشنز، لاہور

اشاعت: .... مارچ 2011ء

ٹائٹل ڈیزائن: .... محمد ذیشان مظہر

قیمت: .... 180.00 روپے

احمد پبلی کیشنز لاہور
ملک بلڈنگ نمبر 1، A-19، ایبٹ روڈ، لاہور۔
فون: 042-36307828 فیکس: 042-36314383
ای میل: ghalibooks@yahoo.com

انتساب

عوام کے نام

آخری فتح جن کی منتظر ہے!

چند ضروری وضاحتیں

پہلی وضاحت تو یہ ہے کہ ''فوج کا سیاسی کردار'' جناب ذوالفقار علی بھٹو کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے طاہر اصغر نے جناب بھٹو کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے چنا اور ترتیب دیا ہے۔

دوسری وضاحت یہ کہ فوج کا سیاسی کردار پاکستان کا ایک بنیادی مسئلہ ہے جس پر اب تک کئی جرنیلوں کے مؤقف شائع ہو چکے ہیں۔ تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اہم ترین ''سیاسی سائنس دان'' جناب بھٹو کے خیالات پیش کیے جا رہے ہیں۔

تیسری وضاحت یہ کہ ہر محب وطن کی طرح...... پاکستان کی دفاعی افواج کا احترام اور وقار تو ہم سب کے دل میں بھی موجزن ہے لیکن اس کے بالکل ساتھ ساتھ پاکستانی فوج کے ان چند مسلح ڈکیتوں کے لیے اپنے دل میں شدید غصہ اور نفرت بھی محسوس کرتے ہیں جنھوں نے محض اپنی ذاتی ہوس کی تسکین کے لیے پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر غاصبانہ قبضہ کیا اور یوں نہ صرف پاکستانی عوام کے اجتماعی شعور کی توہین کی بلکہ دنیا بھر میں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے پاکستان کا نام روشن کرنے والی افواج کا امیج بھی مسخ کیا۔

چوتھی وضاحت یہ کہ پاکستان جمہوریت کے نام پر قائم ہوا تھا اور ہمارا ایمان ہے کہ جمہوریت ہی میں اس کی بقا اور بڑھوتری کا راز پوشیدہ ہے، فوج کو اپنے دائرۂ کار میں پابند رہنا ہوگا جو بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس کے لیے تجویز کیا اور بعدازاں جسے **1973**ء کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔

پانچویں اور آخری وضاحت یہ کہ ''فوج کے سیاسی کردار'' کے بارے میں اگر کسی قاری کو جناب بھٹو کی تحریروں اور تقریروں میں سے کچھ ایسے حوالے مل جائیں جو اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں تو ہمیں فوراً بھجوا دیں تاکہ اگلے ایڈیشنوں میں شامل کیے جا سکیں۔

فہرست

صفحہ

"ایہو اساں جو ملک آہے"

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں اپنی آخری تحریر میں لکھا ہے "حکومت پاکستان کے وزیر کی حیثیت سے میں نے ہر پلیٹ فارم پر شدت ' جوش و جذبے اور پورے ایمان کے ساتھ نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کی۔ میکملن سے ہیتھ تک ہر برطانوی وزیر اعظم سے میری اسی موضوع گرماگرم بحثیں ہوتی رہیں۔ صدرِ پاکستان کی حیثیت سے میں نے برطانوی دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اختیار کی۔ جب میں وزیر اعظم تھا تو میں نے برطانوی تاج کے ہیروں میں سے کوہ نور کی واپسی کا مطالبہ کیا"۔

"نوجوانی ہی کے دنوں میں برطانوی سامراج کا زبردست دشمن رہا ہوں۔ میں نے بمبئی کے کیتھڈرل اور جون کینن ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ یہ برِ صغیر کا بہترین انگریزی سکول تھا۔ اس کے باوجود سکول کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے میں اپنی سرگرمیوں خصوصا "ہندوستان چھوڑ دو" اور "راست اقدام" کے سلسلے میں سرگرمی کی وجہ سے مشکلات سے دوچار رہتا تھا مگر اس سے بھی پہلے '1935ء کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر صرف سات سال تھی۔ میرے والد کو ' جو اس وقت حکومت بمبئی کے وزیر تھے ' بمبئی کے گورنر لارڈ ہاربون نے چائے پر مدعو کیا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی کا جو اس وقت 21 برس کے تھے ' لارڈ ہاربون سے تعارف کرایا گیا تو لارڈ نے کہا "بڑا خوبصورت نوجوان ہے"۔ امداد علی نے نہایت

شائستگی سے کہا! "یہ میرے لئے باعث فخر ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ جملہ ایک خوبصورت گورنر کی طرف سے کہا گیا ہے" مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنی باریک سی آواز میں 'میں اپنی باری کا انتظار کئے بغیر بول اٹھا:

"جناب گورنر اس لئے حسین نظر آتے ہیں کہ وہ ہمارے حسین وطن کے لہو پر پلتے ہیں" لارڈ صاحب سٹپٹا گئے۔ لمحہ بھر کو ہکابکا مجھے تکتے رہے۔ پھر مسکرائے اور میری طرف اشارہ کر کے میرے والد سے مخاطب ہوئے:

سر شاہنواز! اس لڑکے میں مجھے ایک انقلابی اور ایک شاعر یک جا نظر آرہے ہیں"۔

اور میں زندگی بھر یہی کہتا رہا ہوں۔ ایک شاعر اور ایک انقلابی ...... اور اسی طرح رہوں گا جب تک میرے جسم میں ایک سانس بھی باقی ہے۔ یہی جدوجہد تھی جو میں نے برکلے میں تعلیم کے دوران جاری رکھی تھی۔ امریکہ میں جنم لینے والے نو آبادیاتی نظام کے خلاف یا سیاہ فاموں کی ہر انقلابی تحریک میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا برطانیہ میں مجھے کرائسٹ چرچ' آکسفورڈ' اور بعد میں "لنکنز ان" میں زیر تعلیم رہنے کا اعزاز حاصل رہا۔ آکسفورڈ اور لندن دونوں جگہ میں حریت پسندوں کی جدوجہد کے ہراول دستے میں رہا"

"حکومت پاکستان کے وزیر کی حیثیت سے میں نے ہر پلیٹ فارم پر شدت' جوش وجذبے اور پورے ایمان کے ساتھ نو آبادیاتی نظام کے خلاف ان تھک جدوجہد کی۔ میکملن سے ہیتھ تک ہر برطانوی وزیر اعظم سے میری اسی موضوع پر گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے میں نے برطانوی دولت مشترکہ سے علیحدگی اختیار کی۔ جب میں وزیر اعظم تھا تو میں نے برطانوی تاج کے ہیروں میں سے کوہ نور کی واپسی کا مطالبہ کیا سات سال سے پچاس سال کی عمر کا فاصلہ کم نہیں ہوتا"

گورنر کی دعوت سے واپسی پر جب میرے والد نے مجھ سے پوچھا "سائیں! اس فقرے کی کیا ضرورت تھی؟" تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے اور سسکیاں لیتے ہوئے میں سندھی میں چیخ اٹھا "ایہو اَساں جو مُلک آ ہے۔ ایہو اَساں جو ملک آ ہے 'ایہو اَساں جو مُلک آ ہے"

(یہ ہمارا ملک ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے)

"نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں پھنسے ہر ملک کو میں نے "اَساں جو مُلک" سمجھا ہے۔ تیسری دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ "جرنیل راج" ہے۔ تلخ تصادم کی وجوہات ختم ہو گئی ہیں

اور ان کی جگہ انقلابی تبدیلیوں نے لے لی ہے۔ برطانوی حکومت اور عوام نے میرے تین بچوں اور میرے ساتھیوں کو عزت مندانہ طریقے سے جو پناہ دی ہے میں اس کا ممنون ہوں۔ میں نے برطانوی رہنماؤں اور حکومتوں سے ایشیا کی ذہنی اور اخلاقی برابری کے لئے لڑائی کی تھی۔ آج برطانویوں سے لڑائی ختم ہو گئی ہے"

پچھلے تیرہ سالوں کے واقعات سے میں نے ایک انتہائی واضح نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آج تیسری دنیا کے اتحاد اور ترقی کو سب سے بڑا خطرہ "جرنیل راج" سے لاحق ہے۔ فوجی بغاوتیں قومی اتحاد کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ فوجی بغاوتیں آزاد انسانوں کو تقسیم اور مسخ کر دیتی ہیں۔ اگر اس تجزیئے کی صداقت میں کوئی شبہ ممکن بھی تھا تو پاکستان کے واقعات نے تیسری دنیا کے عوام پر یہ حقیقت عیاں کر دی ہے کہ انہیں بنیادی طور پر اس اندرونی دشمن سے خبردار رہنا ہے تبھی غیر ملکی غلبے اور تسلّط پسندی کی مزاحمت ممکن ہے۔ "جرنیل راج" وہ پُل ہے جس سے گزر کر سامراج ہماری سرزمین پر اپنے منحوس قدم رکھتا ہے"

"فوجی انقلاب ایک ناخوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ یہ انتہائی خوفناک روایات اور ورثہ چھوڑ جاتا ہے اگر فوجی انقلاب سیاسی ڈھانچے کا مستقل حصہ بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت کے سوکھے گلاب کی آخری پتی کو بھی نوچ لیا گیا ...... یعنی سیدھی سیدھی تباہی ...... عہد قدیم سے بے شمار قومیں وجود میں آئی ہیں مگر ابدی اقوام بھی اس قسم کی مہم جوئی یا حماقت کا خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔ عالمی جنگوں کے بعد آزادی حاصل کرنے والی اقوام تو کسی صورت بھی اپنے اتحاد اور سلامتی کو اس طرح داؤ پر نہیں لگا سکتیں۔ موجودہ ریاستوں میں سے نئی مملکتوں کا وجود عوام کی مرضی سے ہوا کرتا ہے۔ عوام کی مرضی اور ان کی قربانیوں کے بغیر اس قسم کی مملکتیں وجود میں نہیں آ سکتیں اور اگر یہ مملکتیں اپنے قیام اور اپنے اتحاد کی ضمانت نہیں بن سکتیں تو ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے"۔

"جب مملکتوں کی بقاء کا انحصار چیف آف آرمی شاف کی کرسی پر ہونے لگے تو اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا۔ قائداعظمؒ نے بھی فوج کے لئے کسی مستقل سیاسی کردار کا سوچا تک نہ تھا۔ یہ خیال ہی ان کے لئے تکلیف دہ تھا۔ کاکول میں کیڈٹوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے نصیحت کی تھی کہ وہ حکومت اور آئین کے صحیح معنوں میں اور مکمل طور پر وفادار رہیں۔ مجھے قائدؒ کی یہ تقریر یاد نہ تھی، یہ تو مجھے چیف آف آرمی شاف جنرل ضیاء الحق نے جون 1977ء

کے آخر میں یاد دلائی جب میں مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہو رہا تھا وہ میری کراچی کی رہائش گاہ سے میرے ہمراہ ہوائی اڈے آ رہے تھے اور راستے میں اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف نے کہا تھا کہ میری حکومت سے ان کی وفاداری قائد اعظمؒ کے فرمان کے مطابق ایک واضح اور لازمی فریضہ ہے"۔

"تہذیب کا مطلب مہذب شہری حکمرانی ہوتا ہے۔ فوجی انقلاب کا مطلب تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ یورپ کے پاکستان (جرمنی) میں بھی ایڈولف ہٹلر نے فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا جس طرح ہمارے یحییٰ خاں منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے سے ہچکچاتے رہے، اسی طرح چانسلر ہینڈن برگ نے بھی جرمنی کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے میں تامل کیا تھا۔ انہوں نے ہٹلر اور اس کی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو اقتدار تبھی سونپا جب بیرن وان پاپین نے بیمار چانسلر کو یقین دہانی کرادی کہ وہ ہٹلر سے نمٹ لے گا"۔

"ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا انقلاب اور فرانس اور برطانیہ کے پروردہ یونانیوں کے خلاف شاندار کامیابیوں کے باعث حکمران بنے۔ ایران میں رضا شاہ نے ایران کے اتحاد کو لاحق خطرات کا مقابلہ کے لئے تحریک چلائی"

"صرف ایک مثال ایسی ہے جب کسی فوجی انقلاب نے کسی ملک کے عوام کے مفادات کو تقویت بخشی ہے اور وہ ہے نپولین بونا پارٹ کا انقلاب۔ مگر نپولین ایک عظیم انسان تھا اس جتنا مکمل اور باصلاحیت انسان شاید ہی کوئی ہو۔ اس کی فوجی بصیرت اس کے ہمہ جہت جینئس کا صرف ایک پہلو تھی۔ اس کا نپولینیائی ضابطہ بہت سے ملکوں میں ابھی تک بنیادی قانون شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی منتظم تھا۔ ایک مفکر بھی اور ایک خواب دیکھنے والا بھی۔ میری رائے میں اس کی نثر چارلس ڈیگال کی نثر سے بہتر تھی مگر ان عظیم صلاحیتوں کا حامل فوجی ڈکٹیٹر بھی فرانس کو واٹرلو کے المیئے کی طرف ہی لے گیا"

"وہ بہت مشکل زمانہ تھا اگرچہ تاریخ تسلسل کا نام ہے مگر ہر عہد کو اس کے اپنے زمان و مکان کے حوالے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہمیں ماضی کو نظر انداز کئے بغیر عصری واقعات سے نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ اپنے تجربے اور علم کی بناء پر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں"۔

"اسی پس منظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میری قوم ڈوب رہی ہے۔ اور اس کی قیادت ایسے

لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو تیرنا نہیں جانتے۔ تین فوجی انقلابوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مستثنیات کو چھوڑ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیسری دنیا میں جن ملکوں کو نسبتاً استحکام نصیب ہوا ہے وہ

(ا) مستحکم بادشاہوں

(ب) انقلابی تحریکوں

(ج) سوشلسٹ انقلابوں یا

(د) پارلیمانی جمہوریتوں

میں سے کسی ایک کے ذریعے ہی ملا ہے۔ جہاں کہیں بھی فوجی بغاوتوں کی ریت پڑی ہے، نتیجہ علیحدگی پسندی، سوشلسٹ انقلاب یا دونوں کی صورت میں نکلا ہے۔ مشرقی پاکستان ایک تازہ مثال ہے۔ افغانستان کا انقلاب بھی بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک سوشلسٹ یا ترقی پسند انقلابی تحریک کے لئے داؤد خاں کی فوجی حکومت کا تختہ الٹنا، شاہ ظاہر شاہ کی مستحکم بادشاہت کا تختہ الٹنے سے زیادہ آسان تھا"۔

"مختلف وجوہات کی بناء پر برصغیر الگ درجہ بندی کا متقاضی ہے۔ اس کی روایت میں پنچایتی نظام جیسے قدیم جمہوری ادارے شامل ہیں۔ دوسرے برصغیر کثیر آبادی والا ایک وسیع خطہ ہے۔ تیسرے یہ کہ اشوک کے زمانے سے ہی یہاں عوامی بغاوتیں اور تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بنیادی نوعیت کے مذکورہ بالا اور دوسرے عوامل کے پیش نظر 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانویوں کی رفتہ رفتہ ہندوستان کے عوام کو (قسطوں میں ہی سہی) جمہوریت کی واپسی کا عمل نوّے سال تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ 1947ء میں مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔ ان تین دہائیوں میں مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح جیسے قائدین نے برِصغیر کے عوام کی آزادی اور خود مختاری کی زبردست جدوجہد کی قیادت کی۔ سیاسی شعور اور سیاسی بیداری کے بغیر سالٹ ٹیکس کے خلاف تحریک، تحریکِ خلافت، ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور راست اقدام جیسے ایجی ٹیشن ناممکن تھے اور ان ہنگامہ آرائیوں کے بغیر برطانوی راج کے ستون زمین بوس نہ ہوتے۔ لاطینی امریکہ، افریقہ یا مشرق وسطیٰ کسی جگہ بھی عوامی بیداری کا سبق اس قدر طویل اور اس قدر مسلسل نہیں رہا جتنا برصغیر میں۔ برصغیر کے عوام، ہندو اور مسلمان اپنے سویلین لیڈروں کی قیادت میں صرف نئے جھنڈے لہرانے کے لئے قربانیاں نہیں دے رہے تھے۔ وہ ان قربانیوں کا، جمہوریت اور آزادی کا مزا بھی چکھنا چاہتے تھے"

" آج کل ہمیں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ بجا مگر یہ ملک حاصل کس نے کیا تھا؟ مسلمان عوام نے 'جو قائداعظمؒ کی سویلین قیادت میں یکجا ہوئے تھے یا جرنیلوں کے کسی ٹولے نے؟ یہ ملک مسلمان عوام کی ایک عظیم تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا نہ کہ راتوں رات بپا ہونے والی کسی فوجی بغاوت کے نتیجے میں۔ یہ ملک عوام نے حاصل کیا تھا اور عوام ہی اپنے منتخب رہنماؤں کے ذریعے اسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسلام کے نام پر اسے حاصل کرنے والے ہی اپنے منتخب نمائندوں کو ہدایت کر سکتے ہیں کہ اس کے نام کی لاج کیسے رکھی جائے۔ کوئی ایک غاصب یا غاصبوں کا کوئی ٹولہ اس کا کوئی اختیار نہیں رکھتے نہ ہی ایسے کسی فرد یا گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ طے کرے کہ یہ ملک اسلام کے مطابق چل رہا ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ اجتماعی طور پر پارلیمینٹ کے ذریعے ہو چکا ہے۔ بندوقیں تھامے ہوئے فرد یا افراد کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام بندوق کی نالی سے نہیں نافذ ہونا "

" یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے عوام غیر ملکی تسلّط کو برداشت نہیں کریں گے اور اسی منطق کے مطابق وہ کسی اندرونی تسلّط کو بھی برداشت نہیں کریں گے۔ دونوں قسم کے تسلّط ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اگر عوام اندرونی تسلّط کو خاموشی سے برداشت کر لیں تو پھر انہیں غیر ملکی تسلّط قبول کرنا ہی پڑے گا کیونکہ غیر ملکی تسلّط کی طاقت اندرونی تسلّط کی طاقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر عوام کمزور دشمن کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے ہیں تو طاقتور دشمن کے سامنے کیسے ٹھہر سکیں گے؟ اندرونی تسلّط کو قبول کرنے یا برداشت کرنے کا مطلب غیر ملکی تسلّط کو تسلیم کر لینا ہے اس ملک کے عوام دونوں میں سے کسی تسلّط کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ دونوں قسم کے تسلّط کے خلاف مزاحمت کریں گے۔

" پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا' دُرست۔ مگر اسلام صرف پاکستان ہی میں تو نہیں۔ اسلام خدائے برحق کا پوری دنیا کے لئے آخری پیغام ہے۔ صرف پاکستانی عوام کے لئے نہیں۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ خدا' رب العالمین ہے۔ کائنات اور دونوں جہانوں کا رب۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ مسلمان ایشیا' افریقہ اور یورپ کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں سعودی عرب کے ایک دورے کے دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے فرمایا تھا کہ سعودی عرب 'اسلام کا روحانی مرکز ہونے کے ناطے سے عالم اسلام کی قیادت کا حق دار ہے۔ بلاشبہ ' سعودی عرب دنیائے اسلام کا روحانی مرکز ہے۔ مگر کیا سعودی عرب میں کبھی ایسے جھگڑے کھڑے ہوئے ہیں جیسے پاکستان میں موجودہ حکومت

کھڑے کر رہی ہے ؛ نہیں، روشن خیال سعودی شاہی خاندان کے شاہ خالد کی قیادت میں سعودی عرب بغیر ڈرامائی تنازعات کے آگے بڑھ رہا ہے۔ تختہ اُلٹے جانے سے ایک برس قبل مصر کے شاہ فاروق نے پاکستان کے سفیر سے کہا تھا " آزادی کے بعد، تین سال تک ' پاکستان کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستانی یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلام بھی 14 راگست 1947ء کو وجود میں آیا تھا"۔

"صد شکر کہ سابق مصری حکمران 5 رجولائی 1977ء سے پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ پاکستان کے عوام اور ان کے منتخب لیڈر مسلمان ہیں۔ خواہ لولی چیف الیکشن کمشنران کے خلاف کیسے ہی فتوے جاری کرے اچھا مسلمان وہ نہیں جو جرنیلوں کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔ اچھا مسلمان وہ ہے جو ایک مجاہد کی طرح اپنے مظلوم عوام کے اقتصادی اور سیاسی حقوق کے لئے جہاد کرے۔

"برصغیر لاطینی امریکہ نہیں ہے۔ لاطینی امریکہ کی تاریخی روایت میکسیکو اور برازیل میں بادشاہت مختصر تجربوں کے سوا ایک ظالم نو آبادیاتی آمر (عموماً ہسپانوی یا پرتگالی) سے دیسی فوجی جرنیلوں کو منتقلی رہی ہے۔ میکسیکو اور کیوبا میں انقلاب برپا ہوئے۔ چلی کے پاس ایک مضبوط جمہوری روایت موجود ہے مگر اکثر و بیشتر سلسلہ بیرونی نو آبادیاتی طاقتوں سے اندرونی نو آبادیاتی طاقتوں کو اقتدار کی منتقلی ہی کا رہا ہے"۔

"برصغیر افریقہ بھی نہیں۔ وہاں بھی' چند مستحکم بادشاہتوں کے سوا' روایت برطانوی' فرانسیسی یا پرتگالی نو آبادیاتی آمریتوں سے دیسی آمریتوں کو منتقلی ہی کی رہی ہے۔ گنی' تنزانیہ اور زمبیا کے سوا نکرومہ ایسے تمام افریقی لیڈر جنہوں نے اپنی قوم کی حقیقی آزادی کی طرف رہنمائی کی' فوجی بغاوتوں کا شکار ہوئے۔ ویسے ہی جیسے برازیل کے صدر گولارٹ کا لاطینی امریکہ میں حشر ہوا۔ الجزائر میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ میں یا تو مستحکم بادشاہتیں ہیں یا پھر انقلابی حکومتیں۔ شام اور عراق میں فوجی انقلابیوں کی بیماری کو انقلابی بعث پارٹی کے متضاد گروپوں کے پارٹی کنٹرول نے ختم کیا ہے۔"

"اسلامی وفاقی جمہوریہ پاکستان 14 راگست 1947ء کو وجود میں آئی اور فوجی انقلاب کی پہلی کوشش جنرل محمد اکبر خاں نے 1951ء میں کی دوسرا نیم فوجی انقلاب اکتوبر 1954ء میں برپا ہوا جب غلام محمد نے خود مختار دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ یہ غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام ممکن ہی نہ ہوتا اگر اسے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں کی مکمل حمایت

حاصل نہ ہوتی۔ اس فیصلہ کن حمایت کے بغیر غلام محمد ایسی جرأت نہ کر پاتا۔ تیسرا نیم فوجی انقلاب اکتوبر 1955ء میں رونما ہوا جب 1940ء کی قرارداد لاہور کی مکمل نفی کرتے ہوئے صوبائی خود مختاری کا گلا گھونٹ کر مغربی پاکستان پر ون یونٹ کو مسلط کر دیا گیا یہ شرمناک حرکت انہی مجرموں کی تھی جو ایک سال قبل دستور ساز اسمبلی کے قتل کے ذمہ دار تھے"۔

"اصل وار اکتوبر 1958ء میں ہوا (ایوب خاں کا فوجی انقلاب) مارچ 1969ء میں جنرل یحییٰ کا انقلاب آیا اور پھر مارچ 1973ء میں بریگیڈیروں نے انقلاب بپا کرنے کی کوشش کی۔ 5 جولائی 1977ء کو موجودہ فوجی انقلاب لایا گیا یعنی پاکستان کے تیس برسوں کی تاریخ میں سکور یہ رہا :

(ا) دو ناکام فوجی انقلاب

(ب) دو کامیاب نیم فوجی انقلاب

(ج) تین مکمل اور کامیاب فوجی انقلاب

"اینٹی احمدی (قادیانی) تحریک کے دوران 1953ء میں لاہور کے مارشل لاء کو چھوڑ کر، تیس سالوں میں "خانہ جنگی" کو روکنے کے لئے سات "کوششیں" کی گئیں۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ برطانوی سامراج اور ہندو غلبے سے نجات حاصل کرنے کے لئے تحریک چلانے اور اتحاد و یک جہتی کا بے مثال مظاہرہ کر کے اپنا الگ وطن حاصل کر لینے والی مسلمان قوم، ہر موسم خزاں میں خانہ جنگی کے دہانے پر جا کھڑی ہوتی ہو۔ اقتدار کی نہ بجھنے والی پیاس اور اختیار کی شدید بھوک کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے اس سے کبھی کبھی سوتے جاگتے میں خانہ جنگی کے خواب نظر آنے لگتے ہیں"۔

" آیئے ان فوجی انقلابوں کا ایشیا اور افریقہ کے اسی قسم کے "انقلابوں" سے موازنہ کریں۔ موضوع ذرا نازک ہے اس لئے صرف ایشیا کی دو اور افریقہ کی ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایشیا میں تھائی لینڈ کے پے در پے فوجی انقلابات نے ملک سے علیحدگی کی تحریکوں کو تقویت اور شدت بخش دی ہے۔ اگر تھائی بادشاہت ملکی اتحاد کی علامت کے طور پر موجود نہ ہوتی تو یہ ملک کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ فلپائن میں (سول صدر کی قیادت میں) مارشل لاء نے فلپائنی صوبے منڈاناؤ میں علیحدگی کی تحریک کو شدید تر بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس ملائشیا کی کمزور اور کمسن مملکت غیر متوقع استحکام کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کا سبب جمہوریت ہے"۔

"عظیم اور پیارے ہمسائے بھارت کی ہی مثال لے لیں۔ اگر بھارت کو پاکستان کی طرح

کے بعد دیگرے فوجی انقلابات کی بیماری لاحق ہوتی تو اب تک یہ تین یا چار الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ بھارت پاکستان سے زیادہ مختلف الیئت ملک ہے مگر اسے متحد رکھنا اور ہنگامے یا انتشار سے بچائے رکھنے کا سہرا جمہوریت کے سر ہے"

"افریقہ سے صرف تازہ ترین (فوجی) انقلاب کی مثال دی جاتی ہے۔ اگر ماریطانیہ کا حالیہ فوجی انقلاب اسی نسل کا واقعہ ہے تو یہ لازما اسلامی جمہوریہ ماریطانیہ کے ٹوٹنے پر منتج ہو گا اور یہ دوسری اسلامی جمہوریہ ہو گی جو فوجی انقلابات کی بھینٹ چڑھے گی"

"پاکستان ...... پاک لوگوں کا ملک ہے ...... جرنیلستان بن چکا ہے ...... فوجی انقلابوں کی سرزمین ...... پاکستان میں سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے جرنیل ہر مرتبہ "خانہ جنگی" کا نعرہ بلند کرتے ہیں تاہم جب یہ سازش ناکام ہو جائے تو وہ خانہ جنگی کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔ 1951ء میں جب وزیر اعظم لیاقت علی کی حکومت نے چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل اکبر خاں کے فوجی انقلاب کی کوشش ناکام بنا دی تھی تو انہوں نے فوجی سازشوں کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی تھی۔ انہوں نے سازشیوں کو ملک و قوم اور جمہوریت کے دشمن قرار دیا تھا۔ انہوں نے جرنیلوں کو تنبیہ کی تھی کہ وہ سیاست میں حصہ لینے سے باز رہیں کیونکہ اسی میں پاکستان کا مفاد ہے۔ انہوں نے سازش میں شریک فوجی افسروں کو خود غرض افراد قرار دیا۔ سو یہ فوجی انقلاب ناکام ہوا اور خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ اگر سازشی کامیاب ہو جاتے تو وہ خود کو پاکستان کا نجات دہندہ قرار دیتے۔ جنہوں نے ملک کو "خانہ جنگی" سے بچانے کے لئے بہت ہچکچاتے ہوئے اقتدار پر قبضہ کیا تھا"۔

"1972ء کے آخر اور 1973ء کے آغاز میں، یعنی مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہونے والی المناک خانہ جنگی کے خاتمہ سے بمشکل ایک سال بعد ہی، ایک اور فوجی انقلاب پرورش پا رہا تھا۔ تمام سازشی انقلاب شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں مگر یہ انقلاب کچھ زیادہ ہی شخصی تھا۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل ٹکا خاں نے مجھے رشتہ داریوں کا ایک چارٹ دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ انقلاب کی یہ کوشش بنیادی طور پر آپس میں رشتہ دار افسروں کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس سازش کے بنیادی کردار آپس میں رشتہ داریاں رکھنے والے چند افسر، ان کے دوست اور ان کا سیاسی عزیز تھا جو خود فوج کا ایک سابق اعلیٰ افسر تھا۔ اس ممکنہ فوجی انقلاب کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ سازشیوں نے اپنا آدھا وقت انقلاب برپا کرنے کی وجوہات تلاش کرنے میں صرف کیا اور خود ان کے سیاسی حلیف کے بیانات نے خفیہ ایجنسیوں کو سازشیوں کے

ٹھکانے کی طرف رہنمائی کی۔ سازشیوں کے مقدمہ کی سماعت ان کے اپنے ساتھی افسروں نے کی۔ جنرل ضیاء الحق عدالت کے پریذائیڈنگ آفیسر تھے۔ جب یہ مقدمہ ختم ہوا تو میں نے جنرل ضیاء الحق کو راولپنڈی طلب کر کے ان کے تاثرات پوچھے تو انہوں نے سازش کے اسباب اور محرکات کا ایک تفصیلی تجزیہ پیش کیا۔ جو بات مجھے سب سے نمایاں نظر آئی وہ ان افسروں کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی خود غرضی تھی ان کی سرگرمیوں اور منصوبے میں کسی ٹھوس سبب کا شائبہ تک نہ تھا اور سب سے افسوسناک امر یہ تھا کہ یہ سازش 1971ء کے المیے اور پاکستان ٹوٹنے کے فوراً بعد تیار کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فوجی حکومت کے نتیجے میں رونما ہونے والے تاریخی المیوں سے اقتدار کی خواہش میں اندھے افراد نے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ خون کے دریا ان کے لئے پانی کے مترادف تھے۔ فوجی حکمرانوں کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں میں فاش غلطیوں نے ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ سیاست میں ملوث ہونے کے نتیجے میں فوج میں جو کرپشن ہوئی تھی اس سے کوئی شرمسار نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے المیہ اور نوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی ذِلّت نے ان بدمست افسروں پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا"

"اب میں فوج اور سول اداروں کے باہمی تعلقات کی طرف آتا ہوں میں آزادی سے اب تک کی تاریخ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا نہ ہی وہ سب کچھ دُہرانا چاہتا ہوں جو میں سپریم کورٹ میں مارشل لاء کے خلاف آئینی درخواست کی سماعت کے دوران اپنے حلفی بیان میں کہہ چکا ہوں۔ میں لاہور ہائی کورٹ میں مارشل لاء ضابطہ نمبر 12 کے تحت اپنی نظر بندی سے متعلق اپنے (تا حال) سنسر شدہ بیان کو بھی نہیں دہراؤں گا اور نہ ہی بعد کے واقعات کو' جو میرے خدشات کے عین مطابق رونما ہوئے۔ ہماری تاریخ کے تینوں مارشل لاء عوام کے سامنے ایک آئینے کی طرح ہیں۔ بے تحاشا میک اپ کی وجہ سے عوام پہلے مارشل لاء کا اصل چہرہ صاف طور پر نہ دیکھ سکے تھے تاہم دوسرے مارشل لاء کا "الزبتھ آرڈن مارکہ" میک اپ برہمن پترا کے پانی نے دھو ڈالا۔ موجودہ مارشل لاء کی جھوٹی وگ اور مصنوعی دانت بھی اُتر چکے ہیں اور عوام آئینے میں اس کی مکروہ شکل کو عریاں دیکھ رہے ہیں۔ جب تباہی سر پر ہو تو وہ دلائل کا وقت نہیں ہوتا۔ حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اگر اب بھی پانی سر سے اونچا نہیں ہوا تو بس ہونے ہی والا ہے جو کوئی اس اخلاقی اور روحانی تقسیم کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا پا رہا وہ احمقوں کی جنت میں بس رہا ہے۔ میں وحدت یا کثرت' سیکولرزم یا کٹھ ملائیت' جمہوریت یا آمریت کی بحث کو مختصر کرتا ہوں"

"ابتداء میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے 27 رجولائی 1978ء کے کوئٹہ ایئرپورٹ کے بیان سے کرتا ہوں۔ جنرل ضیاء الحق فرماتے ہیں :

"مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ ملک میں تین طاقتیں ہیں۔ عوامی لیگ ' پاکستان پیپلز پارٹی اور فوج "

اور انہوں نے بقیہ دو کا خاتمہ کر کے اکیلی طاقت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ میں اس بیان کے پہلے حصے کو تسلیم کرتا ہوں۔ اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ 1970ء کے انتخابات کے بعد ابھرنے والی معروضی حقیقت یہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی غالب سیاسی قوتوں کے طور پر ابھری تھی تیسری قوت فوج تھی۔ فوج 1954ء سے کھلے طور پر سیاسی قوت بن کر سامنے آنے لگی تھی۔ تب سے اس کا سیاسی کردار وسیع تر ہوتا رہا تھا۔ کسی موقع پر بھی یہ کردار چھپا نہیں تھا۔ 1969ء میں مارشل لاء کی شکل میں فوج پاکستان کی حکمران تھی۔ دسمبر 1970ء کے انتخابات فوج کے فراہم کردہ لیگل فریم ورک آرڈیننس کے تحت منعقد ہوئے تھے۔ فوج گردن گردن تک سیاست میں دھنسی ہوئی تھی۔ یہ ایک ناخوشگوار اور تکلیف دہ حقیقت تھی مگر حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے "۔

" پاکستان میں فی الواقع تین طاقتیں تھیں۔ عوامی لیگ ' پاکستان پیپلز پارٹی اور فوج۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو سیاست میں حصہ لینے کا پورا پورا حق تھا مگر فوج سیاسی میدان میں ایک زبردست غاصب کے طور پر گھسی ہوئی تھی۔ جنرل کے بیان کا دوسرا حصہ ناقابل فہم اور متضاد ہے۔ اب تک ہم ان کے "حکمت کے موتیوں" کے کافی عادی ہو چکے ہیں۔ بھلا میں کیسے ان دو طاقتوں کو ختم کر کے ایک کو برقرار رکھنا چاہتا تھا؟ اگر یہی نتیجہ اخذ کرنا ہے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ فوج کو عوامی لیگ کے چھ نکات تسلیم کرنے میں کیا چیز مانع تھی ؟ اگر ساڑھے پانچ سال تک پاکستان کی مسلح افواج کے لئے نمایاں خدمات کے عوض چیف آف آرمی سٹاف نے یہی انعام دینا ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مہربانی کو معاف کرنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے "

کہا گیا ہے کہ میں نے فوج کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ کیا نوے ہزار فوجی قیدیوں کو واپس لا کر میں نے فوج کو تباہ کرنا چاہا تھا؟ کیا امریکی اسلحہ کی ترسیل پر سے دس سال پرانی پابندی جنرل ضیاء الحق نے ختم کرائی تھی؟ کیا چین سے ہتھیار بھی اس نے حاصل کئے تھے؟ اسلحہ کی تیاری ' نیوی کی ترقی ' ایئرفورس کے لئے جنگی طیاروں اور افواج کے لئے میزائلوں کے حصول کے لئے

نصف بلین ڈالر اس نے خرچ کئے تھے؟ دفاعی سروسوں کی تنظیم نو کس نے کی تھی؟ دفاعی پیداوار کی وزارت کس نے قائم کی تھی؟ اسلامی ممالک کے ساتھ دفاعی تعاون کا منصوبہ کس کا تھا؟ ایٹمی پلانٹ کیا جنرل ضیاء کا نجی پلانٹ تھا اور اگر میں نے فی الواقع فوج کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی تھی تو اس نے ساڑھے پانچ سال میرے ماتحت کیوں گزارے؟ اور اپریل 1976ء میں سٹاف کالج کوئٹہ میں میرے اعزاز میں دیئے گئے عشائیہ میں یہ الفاظ کیوں کہے؟:

"ہم میں جو لوگ حقائق اور اعداد و شمار سے واقف ہیں، اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں گے کہ 1971ء کے بعد پاکستانی افواج کو جو توجہ ملی ہے اس سے پہلے ساری تاریخ میں کبھی نہیں ملی۔ میرے اور افواج پاکستان کے پاس اس کے صلہ میں دینے کے لئے کچھ نہیں مگر میں اُمید رکھتا ہوں کہ خدا کے فضل و کرم سے ایک روز آپ کے ہوتے ہوئے، پاکستانی فوج اس توجہ اور محبت کا صلہ دے سکے گی اور ثابت کرے گی کہ آپ کی محبت اور مہربانی بے کار نہیں گئی"۔

"مجھے ایسے "زبردست خراج تحسین" ...... وہ فوج کا چیف آف سٹاف بننے سے قبل اور اس کے بعد پیش کرتے رہے ہیں۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد بھی موصوف نے میری تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے"۔

"انہوں نے ہی تجویز پیش کی تھی کہ میں بکتر بند کور کا کرنل انچیف بن جاؤں۔ کھاریاں کی مسند نشینی کی تقریب میں اپنی تقریر میں انہوں نے قصیدہ خوانوں کو مات کر دیا تھا"۔

"اگر میں در حقیقت فوج کا دشمن تھا اور اسے تباہ کر دینے پر تلا ہوا تھا تو "اسلام کا ایک سپاہی" میرے مذموم ارادوں سے اتنی دیر تک بے خبر نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی ایک "مرد مومن" میرے عظیم سپریم کمانڈر ہونے پر مجھے اس قدر فراخدلی سے خراج تحسین پیش کر سکتا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں تو فوج کا دشمن ہوں ....!"

سیاست سے پاک فوج کو سلام

20ر دسمبر 1971ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے صدر پاکستان کی حیثیت سے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی صدارتی تقریر میں کہا :

"میں اپنی بہادر افواج کو جنہوں نے مشرقی پاکستان میں دادِ شجاعت دی ہے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے دل ان کے ساتھ ہیں۔ آپ اسی طرح بہادر و شجاع رہیے جس طرح ماضی میں بہادر اور شجاع رہے ہیں۔ مشکلات سے دل برداشتہ نہ ہویئے۔ ہم اب شکستہ نہیں ہیں۔ ہم طاقتور ہیں۔ ہم اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہم اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہیں کر لیں گے۔ میری پارٹی نے انتخابات میں عظیم اکثریت حاصل کی ہے آپ ہمارے قریب ہیں ان سے بھی زیادہ قریب جو اس وقت میرے نزدیک ہیں آپ ہمت رکھئے ہمارے دل ہماری امنگیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ خالی خولی الفاظ نہیں ہیں۔ آپ دلیر لوگ ہیں۔ آپ بہادر لوگ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ ہرگز یہ نہ سوچیں کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ ہم نشیب و فراز میں آپ کے ساتھ رہیں گے"۔

اسی خطاب میں آگے چل کر کہا :۔

"اب میں کچھ باتیں مسلح افواج کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ مسلح افواج کو جاننا چاہیے کہ میں ہمیشہ ان کا مداح اور معترف رہا ہوں۔ ماضی میں بطور وزیر خارجہ اور بطور وزیر میں مسلح

افواج کو مضبوط اور طاقت ور بنانے کے لئے اپنی بساط کے مطابق کوشاں رہا ہوں۔ پاکستان کی مسلح افواج نے بڑی جانبازی، شجاعت اور دلیری سے اپنی مادر وطن کا دفاع کیا ہے۔ میرے عزیز جوانو! میرے عزیز افسرو اور میرے پیارے بھائیو! آپ بڑی دلیری سے لڑے آپ کو کسی بات کی فکر نہیں ہونی چاہئے۔ آپ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر آپ شرمسار ہوں۔ آپ ایک نظام اور ایک سسٹم کا نشانہ بنے۔ آپ جس نظام کا شکار ہوئے ہیں ہم اس نظام کو درست کریں گے۔ میں آپ سے براہ راست رابطہ قائم کروں گا۔ میں ہر چیز کی نگرانی نہیں کر سکتا لیکن موجودہ نازک صورت حال کی بناء پر میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ صدر اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے عہدہ کے علاوہ دفاع اور خارجہ امور کے محکمے بھی اپنے ہی پاس رکھوں۔ دوسرے محکمے جب ضروری ہوا میں تقسیم کر دوں گا تاکہ دوسرے اصحاب میری مدد کریں۔ ہم مل جل کر کام کریں گے جو بھی آپ کی شکایات ہوں ہم انہیں دور کریں گے آج آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کو ٹھیس پہنچی ہے۔ ہم خود بھی مضطرب ہیں۔ آج آپ (دشمن سے) بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ تھوڑا سا انتظار کیجئے ہم مل جل کر ایسی سکیم بنالیں گے جس سے قومی وقار، عزت اور ساکھ بحال ہو جائے۔ یہ سکیم ہماری اور آپ کی عزت بحال کر دے گی ہم میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں۔ عوام اور مسلح افواج ایک ہیں۔ خرابی اس لئے پیدا ہوئی کہ عوام اور مسلح افواج میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ مسلح افواج عوام ہی سے بنیں۔ عوام ہی مسلح افواج بناتے ہیں لہٰذا ہم پاکستان کے عوام اور مسلح افواج کو پھر یک جان کر دیں گے لیکن مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی اعانت کی ضرورت ہے"۔

"لیکن اس سلسلہ میں بعض ضروری اقدامات کئے جا چکے ہیں میں بوجھل دل کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے بعض اقدامات کئے ہیں جو فوری طور پر نافذ ہوں گے۔ چند جرنیل ریٹائر کر دیئے گئے ہیں۔ سابق صدر پہلے ہی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آج انہوں نے مجھے جتایا "میں ریٹائر ہو چکا ہوں" لہٰذا سابق صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خاں مسلح افواج میں نہیں رہے وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور اسی طرح جنرل عبدالحمید خاں جنرل ایس جی ایم پیرزادہ، جنرل عمر جنرل خداداد خاں اور جنرل مٹھا بھی (ریٹائر کئے جا رہے ہیں) .... یہ جنرل ایسے ہیں جنہیں عوام اور مسلح افواج کے مطالبہ پر ریٹائر کیا گیا ہے۔ یہ میرا ذاتی فیصلہ نہیں ہے۔ میں ان میں سے اکثر کو جانتا بھی نہیں اور ان میں سے اکثر کو ملا بھی نہیں لیکن تبادلہ خیال اور صلاح مشورے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

عوام اور مسلح افواج کی منشا یہی ہے میں اپنے عوام کا خادم ہوں۔ مجھے ان کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ مجھے مسلح افواج کے جذبات کا احترام کرنا ہے۔ یہ جرنیل ریٹائر ہو چکے ہیں اور وہ اب فرائض منصبی ادا نہیں کر سکتے۔ انہیں باعزت طور پر ریٹائر کیا گیا ہے اور ان کے جانشینوں کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ یہ میرا پہلا فیصلہ ہے اور میرے خیال میں یہ ہماری مسلح افواج نوجوان افسروں اور عوام کی خواہشات کے مطابق ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ سب کچھ عارضی ہے۔ میری حیثیت بھی عارضی ہے۔ تمام انتخابات عارضی ہیں۔ میں نے لیفٹیننٹ جنرل گُل حسن کو پاک افواج کے قائم مقام کمانڈر انچیف کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے کہا ہے اور وہ جلد ہی اس حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیں گے اب انہیں شب و روز کام کرنا ہو گا۔ وہ سپاہی ہیں ...... پیشہ ور سپاہی۔ میرا خیال ہے وہ سیاست میں ملوث نہیں ہوں گے۔ انہیں پاک افواج میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں فوج کی مکمل حمایت بھی حاصل ہے۔ میرے اس فیصلہ سے کسی کو غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ یہ عارضی انتظامات ہیں۔ مستقل انتظامات بعد میں اس وقت کئے جائیں گے جب میں اس مسئلہ پر پوری توجہ اور گہرائی کے ساتھ صلاح مشورے کر لوں گا۔ جناب گُل حسن لیفٹیننٹ جنرل ہی رہیں گے۔ ہم غیر ضروری ترقیاں نہیں دے سکتے۔ ہمیں آج جو دن دیکھنا پڑا اس کی وجہ اس قسم کا تعیش بھی ہے چنانچہ جناب لیفٹیننٹ جنرل گُل حسن کو جنرل کے عہدے پر ترقی کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔ یوں بھی یہ انتخابات عارضی ہیں"۔

"مجھے توقع ہے لیفٹیننٹ جنرل گُل حسن قائمقام کمانڈر انچیف کو عوام اور حکومت کی امداد حاصل ہو گی۔ میں بھی ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جناب گُل حسن فوج کو نئے سرے سے منظم کریں گے اور آزاد پیپلز آرمی کی طرز پر ترتیب دیں گے"۔

29؍ دسمبر 1971ء کو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے پنجاب یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ججوں مجسٹریٹوں اور وکلاء کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا :-

"مجھے علم ہے کہ عوام بہت سی باتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں ہم نے فوج کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک کیا ہے۔ پاکستان کے عوام کی طرح مسلح افواج سے بھی دھوکہ کیا گیا ہے۔ ہمارے جوان افسر اور سینئر افسر بھی بہادر ہیں۔ انہوں نے سخت مشکلات کے باوجود دشمن کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا لیکن پاکستان کے عوام کی طرح وہ بھی موجودہ نظام کا شکار ہو گئے۔ اپنی تاریخ کا تلخ سبق حاصل کرنے کے بعد آپ کو اس بارے میں مکمل طور پر اطمینان رکھنا چاہئے کہ ہم

آمریت کی لعنت کو دوام بخشنے کی کوشش نہیں کریں گے"۔

"آمریت تباہ کن ہوتی ہے۔ اس نے ہمارے ملک کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں جو ہزیمت اٹھانی پڑی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت کی آبادی یا دوسرے وسائل زیادہ تھے بھارت کی کامیابی کا ایک سبب آزادیٔ تقریر تھی۔ وہاں اسمبلیاں تھیں اور حکومتوں کا محاسبہ ہوتا تھا۔ ہمارے ملک میں محاسبہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ محاسبہ کے بغیر عصرِ حاضر کے معیاروں کو برقرار رکھنا ممکن نہ تھا اس لئے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ہر فرد اور ہر ادارہ کے محاسبہ کا طریقہ اپنائیں"۔

"مسلح افواج اور عوام ایک دوسرے سے دُور کر دیئے گئے ہیں ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہئے مسلح افواج عوام سے ہی بنتی ہیں۔ اگر عوام میں خرابیاں ہوں تو فوج اچھی نہیں ہو سکتی۔ محاسبہ کا فقدان اور فوج اور عوام میں دُوری موجودہ صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے تحت عوام اور مسلح افواج کے درمیان ہم آہنگی قائم ہو اور معاملات کا فیصلہ آزاد عدلیہ کرے"۔

11 ر فروری 1972ء کو کراچی میں پاک۔بحریہ کے افسروں اور ملاحوں سے خطاب کرتے ہوئے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا:۔

"پاکستان کی بحریہ کو ملکی تعمیرِ نو میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ بحریہ ہماری مسلح افواج کا اہم ترین جزو ہے اور پاک۔بحریہ نے بھارت کے خلاف 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں جس خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں قوم کو ان پر فخر ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ماضی میں بحریہ کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسے کماحقہٗ اہمیت نہیں دی گئی لیکن ہمیں ماضی کو فراموش کر دینا چاہئے ہم آپ کے نظم و نسق، جرأت اور بہادری کی قدر کرتے ہیں۔ پوری قوم کو اپنی بحریہ پر فخر ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مسائل پر برابر توجہ دے رہا ہوں اور آپ کی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے"

"اس وقت ملک کے سماجی اور اقتصادی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانا ناگزیر ہے کیونکہ ملک کی ہمہ گیر ترقی کے لئے ایسا ضروری ہے۔ اگر معاشی طور پر پاکستان کمزور ہو گا تو ہم اس میں ایک مضبوط مسلح فوج نہیں رکھ سکیں گے اور اصولاً ہمیں مستقل طور پر کسی ملک کا دستِ نگر نہیں بننا چاہئے کیونکہ یہ بات قوم کے وسیع تر مفاد کے منافی ہے۔ ہم دوسروں سے امداد حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اپنے وسائل بھی بروئے کار لانا چاہئیں۔ ہمیں اپنی بنیادی ضروریات خود

پوری کرنا چاہئیں اور اس طرح پاکستان کی تعمیر نو کرنا چاہئے۔ پاکستان کی ترقی کے کام میں پاک بحریہ اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔

"3 ر مارچ 1972ء کو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے فوج میں اہم تبدیلیوں کا اعلان کرتے ہوئے کہا:۔

"میں نے 20 ر دسمبر 1971ء کو جب صدرِ مملکت کا عہدہ سنبھالا اس وقت ملک کے آدھے حصے پر فوج کا قبضہ ہو چکا تھا میں نے اس روز آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ نے مجھے بھاری ذمہ داری سونپی ہے .... میں نے فوج میں جو تبدیلیاں کی ہیں وہ عوام اور مسلح افواج کے مفاد میں ہیں ہم نے بری اور فضائی افواج کے کمانڈر انچیف کی جگہ نئے سربراہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کا سابقہ ریکارڈ شاندار ہے اور انہیں یہ ترقی ان کی قابلیت کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ جنرل گل حسن مستعفی ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ جنرل ٹکا خاں کو فوج کا چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا ہے۔ ایئر مارشل اے رحیم خاں کی جگہ ایئر مارشل ظفر چودھری نے سنبھال لی ہے اب مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کا عہدہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تینوں فوجوں کے سربراہ چیف آف سٹاف ہوں گے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا کے کئی ملکوں میں یہ تجربہ کامیاب رہا ہے ان تبدیلیوں کے ذریعے ہم نے دفاعی فوج کا نو آبادیاتی ڈھانچہ توڑ دیا ہے اور انقلابی بنیادوں پر فوج کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ہم اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ پاکستان کی فوج کو ناقابل تسخیر بنا دیا جائے۔ ماضی میں ہماری فوج شاندار کارنامے انجام دے چکی ہے۔ ہم اسے نئے سرے سے منظم کریں گے اور پاکستان کی فوج ایشیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج ہو گی وقت کے ساتھ ساتھ ہم فوج کو یقیناً ناقابل تسخیر بنا دیں گے"

"میں نے فوج میں جو اصلاحات نافذ کی ہیں وہ اسی مقصد کے لئے کی گئی ہیں ہمارے فوجی افسر مخلص ہیں جو اپنی افواج کی کارکردگی کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے تاکہ اسے ایشیا کی سب سے طاقتور فوج بنا دیا جائے۔ ہم فوج سے "بونا پارٹ ازم کے اثرات ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ "بونا پارٹ ازم" کے خاتمہ کا مطلب یہ ہے کہ پیشہ ور فوجی پیشہ ور سیاست دان نہ بنیں۔ سب سے پہلے 1954ء میں اور اس کے بعد 1958ء میں بعض پیشہ ور جرنیلوں نے سیاستدان بننے کی کوشش کی جس سے ملک کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اس مقصد کے لئے فوج میں سے پیشہ ور سیاست دانوں کے اثرات کا خاتمہ ضروری ہے"

"فوج میں تبدیلیوں کا فیصلہ بڑا سخت اور اہم فیصلہ تھا لیکن ملک قوم اور خود فوج کے مفاد

جب شیر یا ہاتھی زخمی ہو کر گر پڑتا ہے تو کیڑے مکوڑے بھی نکل پڑتے ہیں۔ جب آمریت پورے شباب پر تھی تو یہ لوگ کمروں میں بند دبکے بیٹھے تھے۔ اب یہ پھر باہر نکل آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے جمہوریت بحال کرانے کی جدوجہد کی تھی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عوام کی جدوجہد تھی اس لئے فتح عوام کی ہوئی ہے۔ ڈرائنگ روم کی سیاست سے آمریت ختم نہیں ہو سکتی تھی"۔

اسی تقریر میں جناب بھٹو نے آگے چل کر کہا "ساتھیو! میں نے کراچی میں بھارت اور پاکستان کی لڑائی کے بارے میں کچھ تبصرہ کیا تھا۔ میں ساڑھے تین سال تک خاموش رہا، لیکن میرے بارے میں یہ کہا جاتا رہا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ میرے رفیقو! ملک کے اندر اور باہر میرے خلاف سازشوں کے بہت سے جال بُنے گئے۔ مجھے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میں خاموش رہا، کیونکہ وقت کا تقاضا تھا۔ وہ ایوبی دور تھا اور سیاست کا یہی تقاضا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وقت ضرور آئے گا جب عوام خود دیکھ لیں گے کہ کس نے قوم اور ملک سے غداری کی اور کون ان کا خادم اور دوست ہے۔ ساڑھے تین سال کے دوران مجھ سے جو سلوک روا رکھا گیا وہ ایک لمبی داستان ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں نے سب مظالم برداشت کئے لیکن میں شعیب (سابق وزیر خزانہ) کی طرح ملک چھوڑ کر نہیں گیا۔ اب ایوبی دور ختم ہو چکا ہے۔ نیا دور طلوع ہو رہا ہے اگر میں آپ کی خدمت کرتا رہوں تو آپ بھی میرا ساتھ دیں اگر آپ کو فریب دوں یا کبھی فریب دیا ہو تو میرا گریبان پکڑ لیں۔ میں آپ کو فریب نہیں دے سکتا کیونکہ میرا یہی وطن ہے اور ہم سب کو یہیں رہنا ہے"۔

"میں نے کراچی میں کہا تھا کہ اعلانِ تاشقند سے آہستہ آہستہ پردہ ہٹاؤں گا۔ ملک کا مفاد بہرصورت مقدم ہے۔ صرف ایسی باتیں ہی کہی جا سکتی ہیں جو قانون کے دائرے میں درست ہیں اور قومی مفادات کو متاثر نہ کریں۔ اعلان تاشقند کا 1962ء کی اس لڑائی سے گہرا تعلق ہے جو بھارت اور چین میں ہوئی۔ اس وقت بھارت چین کی حمایت کرتا تھا جب کہ پاکستان اور چین کے تعلقات خراب تھے کیونکہ پاکستان سیٹو اور سنٹو کا رکن تھا۔ یہ ملک ایک طاقت کا غلام تھا اور اس کی تمام تر توجہ صرف ایک ملک کی امداد و حمایت پر تھی۔ ہماری خارجہ پالیسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ملک پر آمریت مسلط تھی۔ حکمران جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ پریس آزاد نہ تھا اس لئے حکمران یک طرفہ پالیسی پر گامزن تھا۔ چین کے ساتھ روس بھی پاکستان کے خلاف تھا۔ مسلمان ملکوں سے بھی پاکستان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے لیکن

اس وقت ہمارے مخالف لیڈر نہ جانے کہاں تھے۔ جب دنیائے اسلام ہمارے خلاف تھی۔
میں نے وزیر خارجہ بنتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اپنے مسلمان ہمسائے افغانستان کے ساتھ
تعلقات بحال کئے جائیں گے۔ پاکستان جیسے بڑے اسلامی ملک کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ
اس کے تعلقات مسلمان ہمسایہ ملک کے ساتھ نہایت اچھے ہوں"۔

" آپ کو یاد ہوگا 1962ء میں جب چین اور بھارت کی لڑائی شروع ہوئی ، ہمارے
شہسوار (اشارہ ایوب خاں کی طرف ہے) ہنزہ کی سیر و سیاحت میں معروف تھے۔ ان دنوں
ایک تصویر بھی اخباروں میں آئی۔ صدر صاحب ایک خچر پر سوار سیر کر رہے تھے۔ پورا ہمالیہ لرز
رہا تھا۔ چین کا سایہ آسام کو ڈھانپ رہا تھا۔ امریکی سفیر ہمارے صدر کے لئے خاص پیغام لے
کر پھر رہا تھا۔ لیکن ہمارا شہسوار اس وقت ہنزہ سے واپس آیا جب لڑائی ختم ہو گئی۔ حالانکہ وہ
وقت تھا جب ہم کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔ یہ بہت ہی اہم موقع تھا۔ بھارت
ساری فوجیں مقبوضہ کشمیر سے نکال چکا تھا۔ کشمیر خالی پڑا تھا۔ اگر پاکستان کوئی قدم اٹھاتا تو یہ
انصاف کے عین مطابق ہوتا اور تنازعہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ عالمی رائے عامہ بھی اسے بجا حق
تسلیم کر لیتی لیکن اس وقت ہمارے شہسوار نے کہا کہ ہم ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔ جیسے
ہم کوئی ڈاکہ ڈال رہے تھے۔ عالمی رائے عامہ کا کیا خوف تھا۔ اقوام متحدہ کیا کر سکتی تھی جو خود کشمیر
کا مسئلہ حل نہیں کرا سکتی۔ فلسطین میں اپنی قراردادوں پر عمل نہیں کرا سکتی"۔

"میرے ساتھیو! اقوام متحدہ کچھ نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا فراڈ ہے' کمزور قوموں کے
خلاف۔ ! قومیں اپنا فیصلہ خود کیا کرتی ہیں۔ کوئی بھی مقصد آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔
منزلوں کے راستے کٹھن اور دشوار ہوا کرتے ہیں۔ بہادر قومیں ہی انہیں طے کرتی منزل کی
طرف بڑھتی ہیں بشرطیکہ قیادت بزدل نہ ہو اور قائد خود قوم کی رہنمائی میں آگے آگے ہو لیکن
ہمارا لیڈر عالمی رائے عامہ کے ڈر سے خاموش رہا اور اس طرح ایک بہترین موقع گنوا دیا گیا۔ خود
بھارت کے اخبارات نے بھی اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ کوئی راز
نہیں رہا۔ یہ باتیں ہندوستانی اخبارات میں چھپ چکی ہیں"

"ساتھیو ! میں نے 1962ء کی لڑائی کے وقت ہی جان لیا تھا کہ امریکہ کی پالیسی میں
تبدیلی یقینی امر ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ روس اور چین کے تعلقات خراب ہو جائیں لیکن ہم
نے اپنی خارجہ پالیسی کا دھارا وقت کے تقاضوں کی سمت نہ پھیرا۔ محمد علی بوگرہ مرحوم نے اس
سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش کی لیکن انہیں موت نے ہم سے چھین لیا۔ میں نے خارجہ پالیسی

میں ملکی مفادات کے تحت تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ میں نے جان لیا تھا کہ امریکہ بھارت کی دوستی حاصل کرنے کے لئے اپنے دوست پاکستان پر ضرور دباؤ ڈالے گا اور بھارت پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرے گا کیونکہ اس نے پاکستان کا وجود کبھی سچے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ امریکہ کی پالیسی میں تبدیلی ہوئی۔ لیکن میرے پاس وقت کم تھا۔ اس کے علاوہ ماحول بھی میرے حق میں نہیں تھا اور ہمارے شہسوار نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ وہ حالات میں تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور امریکہ سے دوستی قائم رکھنے پر مُصر تھا۔ اسے حقیقت پسندی پر مائل کرنے کے لئے سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا"۔

"ساتھیو! آپ نے دیکھا کہ 1965ء کی جنگ میں ساری دنیا نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ خود بھارت کے وزیر اعظم کو اقرار کرنا پڑا کہ ان کا ملک دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔ وہی مصر' جس نے ہمارے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کو قاہرہ میں اُترنے کی اجازت نہ دی تھی اور وہ عرب ملک جو بھارت کی حمایت کیا کرتے تھے۔ اب پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہی چین جہاں چینی بھارت دوستی کے نعرے بلند ہوا کرتے تھے'

5 ستمبر 1965ء کی جنگ میں بھارت کو الٹی میٹم دے رہا تھا۔ روس جو کشمیر کو متنازعہ مسئلہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا اس مسئلے کو طے کرنے پر زور دے رہا تھا حتیٰ کہ برطانوی وزیر اعظم ولسن نے بھی یہ اعلان کیا کہ بھارت نے پاکستان کے خلاف جارحیت کی ہے۔ لاطینی امریکہ' مشرق وسطیٰ اور پورا ایشیا پاکستان کے ساتھ تھے۔ صرف ملائشیا اور یوگوسلاویہ بھارت کے ساتھ تھے اور وہ مسئلہ کشمیر جس کا ذکر آپ کے مشترکہ اعلانوں میں بھی نہ ہوتا تھا پھر زندہ ہو گیا۔ انڈونیشیا نے ہر طرح ہماری مدد کی۔ شہنشاہ ایران کی امداد کو پاکستان کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ ہماری خارجہ پالیسی میں یہ فرق میرے وزیر خارجہ بننے کے بعد پڑا لیکن میری علیحدگی کے ایک سال بعد ہمارے شہسوار نے ایران سے بھی تعلقات خراب کر لئے۔ جب برطانیہ اور امریکہ پاکستان کے خلاف اقوام متحدہ میں تجارتی بائیکاٹ کی قرارداد پیش کر رہے تھے تو فرانس کے صدر ڈیگال نے یہ اعلان کیا کہ ان کا ملک پاکستان کے خلاف قرارداد پر ویٹو استعمال کرے گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ جن ملکوں نے ہمارے خلاف جنگ میں بھارت کی مدد کی' پاکستان نے سب سے پہلے ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور فرانس کا شکریہ تک ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ جس کا شکوہ اس کے وزیر خارجہ نے بھی کیا۔ اس کے برعکس ایوب خاں نے ٹیلی فون کیا تو برطانوی وزیر اعظم ولسن اور امریکی

صدر جانسن کو ...... لیکن پاکستانی اخبارات میں یہ خبر اس طرح شائع کرائی گئی کہ جانسن نے ایوب خاں کو ٹیلی فون کیا تھا"۔

"ایوب خاں مجھے ' جو ان کا وزیر خارجہ تھا ' سلامتی کونسل میں بھیجنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ میرے نیویارک پہنچنے پر امریکی اخبارات نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ایوب خاں نے امریکی سفیر کو یقین دلایا تھا کہ وہ بھٹو کو سلامتی کونسل میں نہیں بھیجے گا۔ میرے خلاف تین سال تک گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے۔ میں نے اب تک خاموشی اختیار کئے رکھی۔ اگر میں نے عوام کی خدمت نہیں کی تو مجھ سے حساب لو ورنہ اپنا حساب دو۔ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنے وطن کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ میں بھارتی شہری ہوں کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے ہاریوں کا حق چھین لیا ہے۔ میں عوام کی عدالت میں حاضر ہوں ' آؤ اپنا الزام ثابت کرو۔ میں پوچھتا ہوں کہ مجھے اس لئے نہیں جیل میں بھیجا گیا تھا کہ میں عوام اور اپنے ملک کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ جیل میں میرے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔ میں اب عوام کو اصل حقائق سے روشناس کراؤں گا۔ میں نے بہت کچھ برداشت کر لیا ہے"۔

"ساتھیو! یہ کہا گیا تھا کہ ملک کے اندر میری بہت ضرورت ہے اس لئے میرا سلامتی کونسل میں جانا مناسب نہیں ہے۔ میرے نوجوان دوست سید محمد ظفر کو سلامتی کونسل میں بھیجا گیا لیکن انہوں نے نیویارک سے ٹیلی فون پر کہا کہ بھٹو کو یہاں بھیجو۔ حالات خراب ہیں۔ میں ناواقف ہوں۔ بھٹو صاحب یہاں کے حالات بہتر سمجھتے ہیں اس کے باوجود کہ جنگ جاری تھی اور دو روز قبل گجرات (بھارت) کے وزیر اعلیٰ طیارے کے حادثے میں مارے جا چکے تھے۔ راولپنڈی سے میری روانگی کے ساتھ ہی ریڈیو پر یہ اعلان کرا دیا گیا کہ میں نیویارک جانے کے لئے کراچی روانہ ہو گیا ہوں۔ طیارے کے پائلٹ نے بھی اس اعلان پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ بھارتی جہاز ہمارے پیچھے لگ جائیں گے تاکہ اپنے دشمن نمبر 1 کو ختم کر سکیں۔ ہمیں اپنا طیارہ سیدھے رستے کی بجائے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لے جانا پڑا اور اسی وقت کراچی سے نیویارک روانہ ہو جانا پڑا لیکن نیویارک پہنچ کر مجھے بتایا گیا کہ مجھے تقریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ راولپنڈی سے فیصلہ آنے والا ہے۔ آپ صرف اسے پڑھ کر سنا دیں"۔ (یہ فیصلہ لڑائی بند کرنے کا تھا)

"ساتھیو! آپ کو معلوم ہے میں نے سلامتی کونسل کو بتایا کہ پاکستان کے ساتھ کیا ظلم

ہوا ہے۔ کشمیریوں سے کیا سلوک ہو رہا ہے۔ آپ نے میری اس تقریر کو بے حد پسند کیا تھا لیکن اس سے زیادہ اہم دوسری باتیں ہیں جو میں نے اپنے ملک اور قوم کے لئے کیں۔ میں آئندہ دس ماہ کے دوران انہی اہم قومی امور پر روشنی ڈالوں گا۔ کیونکہ یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جو قوموں کی تعمیر کرتی ہیں اور انہیں تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتی ہیں۔ میں کشمیر پر بات کروں گا۔ میں ملک کی سالمیت پر بات کروں گا۔ میں نے کراچی میں رن کچھ کے بارے میں زبان کھولی تھی اور یہ اعلان بھی کیا تھا کہ راولپنڈی میں مزید روشنی ڈالوں گا۔ آج جب میں چکلالہ کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو مجھے تین افراد ملے۔ ان میں سے ایک کا نام میں جانتا ہوں' ان کا نام کرنل قریشی ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں راولپنڈی میں اعلان تاشقند اور رن کچھ کے بارے میں کچھ نہ کہوں۔ کیونکہ یہ سرکاری رازوں کے ایکٹ میں آتے ہیں لیکن میں کسی قسم کی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہوں گا اور عوام کو اصل حقائق سے ضرور آگاہ کروں گا"۔

"عوام میری گول میز کانفرنس ہیں۔ سب سُن لیں۔ مجھے اقتدار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں پہلے بھی قومی سالمیت کے لئے اقتدار چھوڑ چکا ہوں۔ اب بھی مجھے کرسی کی پرواہ نہیں"۔

"میں سرکاری رازوں کے قانون سے واقف ہوں ...... ملک کا وزیر خارجہ رہ چکا ہوں۔ خود بھی قانونی ڈگریاں رکھتا ہوں۔ بُرا بھلا سب جانتا ہوں۔ یہ کتنا ظلم ہے کہ مجھے ایسی باتیں کہنے کی اجازت نہیں دی جاتی جن سے ملک کو نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ ایوبی دور ختم ہو گیا ہے۔ ایوب نے ملک اور قوم کو جو نقصان پہنچایا ہے۔ مجھے اجازت دو کہ قوم کو اس سے آگاہ کروں۔ ایوب۔ تاشقند میں کیا کیا۔ موسیٰ کا کیا کردار رہا۔ میں ضرور ان پر روشنی ڈالوں گا"۔

8 مارچ 1970ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے موچی دروازہ لاہور میں جلسہ عام سے خطاب کے دوران کہا۔ "میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ میری تقریر سننے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ تقریباً ایک سال پہلے میں نے اسی مقام پر تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ پاکستان میں آمریت باقی نہیں رہے گی۔ پاکستان کے عوام نے آمریت کو شکست دے دی ہے اور اگر کسی اور شخص نے آمریت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف بھی ہم جہاد کریں گے۔ جب ایوب خاں کے خلاف عوامی جدوجہد جاری تھی تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ایوب خاں کی آمریت کو کوئی نہیں ہلا سکتا۔ کیونکہ سرکاری ملازم اس کے ساتھ ہیں' فوج اس کے ساتھ ہے' پولیس اس کے ساتھ ہے' سرمایہ دار اور جاگیردار اس کے ساتھ ہیں' اَرکانِ بنیادی جمہوریت اور ایک بہت بڑی جماعت (جو اب تین حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے) اس کے ساتھ

ہے (اشارہ مسلم لیگ کی جانب ہے۔ جو بعد ازاں اتنے حصّوں میں تقسیم ہو چکی ہے کہ اس کے ٹکڑوں کی تعداد شاید ہی کسی کو یاد ہو۔ مرتب) ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس پر ایوب خاں کا قبضہ ہے اور جب تک ایوب خاں زندہ ہے اس کی حکومت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا"۔

ایوب خاں اپنے بعد اپنے بیٹے کو پاکستان کا سربراہ مملکت بنانا چاہتا تھا لیکن آپ نے دیکھا کہ پاکستان کے مزدوروں، کسانوں، طلبہ، خواتین اور دوسرے لوگوں نے متحدہ محاذ بنا کر ایوب خاں کی آمریت، رشوت ستانی، نوکر شاہی اور ظلم کے خلاف عظیم عوامی تحریک چلائی اور ایوب خاں کو اقتدار سے دستبردار ہونا پڑا۔ عوامی جدوجہد کی کامیابی کی ایسی مثال دنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جب بھی کسی ملک میں فوجی آمریت قائم ہوتی ہے تو اسے ختم کرنے کے لئے عموماً فوجی انقلاب ہی آتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوا اور یہ اس وقت بھی نہیں ہوا جب ایوب خاں بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ ہمارے ملک میں آمریت کو ختم کرنے کا سہرا عوام کے سر ہے اور میں عوام کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں لیکن یہ بات سب پر واضح ہے کہ آمریت کو ختم کرنے کے سلسلے میں کسی حد تک پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ 21 ستمبر 1968ء کو اپنی حیدر آباد کی تقریر میں میں نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کے عوام ایوب خاں کی آمریت کے خلاف ہیں اور وہ متحد ہو کر آمریت کو آخری لات مارنے کے لئے تیار ہیں......

ساتھیو اور دوستو! جیت آپ کی تھی لیکن اس میں کسی حد تک پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی ہاتھ تھا۔ جب ایوب خاں کی آمریت کے خلاف عوامی تحریک زوروں پر تھی اور اسے خطرہ محسوس ہونے لگا تو اس نے گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ گول میز کانفرنس عوام کے خلاف بہت بڑی سازش اور دھوکہ تھا۔ میں نے کہا تھا کہ ایوب خاں کو سیاست دانوں سے بند کمروں میں بات نہیں کرنی چاہیے بلکہ کھلے عام بات کرنی چاہئے۔ میں بند کمروں کی سیاست کا قائل نہیں بلکہ عوامی سیاست کا قائل ہوں۔ اسی لئے میں نے لاہور میں کہا تھا کہ عوام ہی گول میز کانفرنس ہیں۔ میں نے اپنے سیاست دانوں سے کہا تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی ایوب خاں سے بات چیت نہ کریں۔ ایوب خاں نے سیاست دانوں کو پہلے تو جیل میں ڈالا اور پھر انہیں گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور یہ لوگ ہاتھوں میں مہندی لگا کر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے جو ایوب خاں کی عوام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی"۔

"میرے عزیز ساتھیوں! قائد اعظم کے انتقال اور لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ہماری سیاست گول میز اور بند کمروں کی سیاست بن گئی۔ گورنر جنرل غلام محمد نے جب

غیر جمہوری طور پر دستور ساز اسمبلی کو توڑا تو پھر ہمارے سیاست دان دوسری دستور ساز اسمبلی کے رکن کیوں بنے؟ کیا یہ ان کا غیر قانونی فعل نہیں تھا؟ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی سیاست کو بند کمروں سے نکال کر عوامی سیاست کو رواج دے گی"۔

"یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ گذشتہ 23 سال کی مدت میں سیاسی اور اقتصادی مسائل حل نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج تک کسی مسئلہ پر عوام کی رائے نہیں لی گئی۔ چند سیاست دان اور سرمایہ دار ہر چیز پر قابض رہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اب سارے فیصلے عوام کریں گے۔ ملک میں اب انتخابات ہونے والے ہیں۔ پاکستان کی 23 سال کی زندگی میں آج تک صحیح معنوں میں انتخابات نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے مسائل بھی حل نہیں ہو سکے"۔

"دوستو اور ساتھیو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ لوگ میرے جلسوں میں تقریر سننے نہیں آتے بلکہ مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا میں کوئی دلیپ کمار ہوں جو مجھے دیکھنے آتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں لوگوں کو جلسوں میں شریک ہونے کے لئے پیسے دیتا ہوں۔ آپ بتائیں میں نے آپ کو کتنے پیسے دیئے ہیں لوگ میرے جلسوں میں اس لئے آتے ہیں کہ میں سچی بات کہتا ہوں۔ میں کسی سے منافقت نہیں کرتا۔ میں نے ملک کو آزاد خارجہ پالیسی دی ہے۔ میں نے ملک کی کافی خدمت کی ہے۔ میں نے عوام کے ساتھ مل کر پاکستان کے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے۔ آمریت کو شکست دی ہے اور میری پارٹی نے عوام کو ان کی امنگوں اور خواہشات کے مطابق منشور اور اقتصادی پروگرام دیا ہے۔ اس لئے انشاءاللہ لوگ میرے جلسوں میں آتے رہیں گے .... ایک سرکاری ملازم نے جو اب 203 کا شکار ہے ایک بار کوٹ کے بٹن بند کر کے بڑی عزت و احترام سے ایوب خاں سے کہا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو تین ماہ میں ختم کر دے گا لیکن وہ اور ایوب خاں، بھٹو اور اس کی تحریک کو ختم نہیں کر سکے اسی طرح جب عوامی جدوجہد سے ایوب خاں کی آمریت ختم ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ اب ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت ختم ہو گئی ہے۔ میرے دوستو اور بھائیو! سن لو۔ بھٹو ختم نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ پاکستان کے عوام بھٹو کے ساتھ ہیں"۔

اسی جلسہ میں جناب بھٹو نے آگے چل کر خارجہ پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:۔

دوستو اور ساتھیو! میرے وزیر خارجہ بننے سے پہلے پاکستان کی خارجہ پالیسی کتنی غلط اور نقصان دہ تھی۔ ہم ایک طرف تھے اور دنیا دوسری طرف۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی نے عوام کو زنجیریں

پہنا رکھی تھیں۔ اپنی مرضی سے نہ تو ہم کسی طرف دیکھ سکتے تھے اور نہ کہیں جا سکتے تھے۔ امریکہ جیسے ہمیں حکم دیتا تھا ہم اس کی تعمیل کرتے تھے۔ روس' چین' افریقہ' افغانستان' ایشیا' لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کے ملکوں سے ہمارے تعلقات خراب تھے۔ ہماری پالیسی سیٹو اور سینٹو کی خارجہ پالیسی تھی۔ پاکستان میں موجود امریکہ کا سفیر جدھر چاہتا پاکستان کی خارجہ پالیسی کا رُخ موڑ دیتا۔ اس نے کہا کہ سویز کی لڑائی کے بارے میں پاکستان کی پالیسی اس طرح ہونی چاہیے۔ وہ اسی طرح ہوتی۔ جب میں وزیر خارجہ بنا تو پاکستان کی خارجہ پالیسی آزاد ہوئی۔ اس کے آزاد کرانے میں کچھ نہ کچھ میرا ہاتھ بھی تھا۔ اب روس' چین' افغانستان' ایشیا' افریقہ' لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کے ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر ہو گئے ہیں۔ پاکستان' ترکی اور ایران کے درمیان علاقائی تعاون برائے ترقی کا ادارہ قائم ہوا۔ اگر میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے بیرون ملک آپ لوگوں کی خدمت کر سکتا ہوں تو اندرونِ ملک اس سے کہیں زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔ اگر میں آپ لوگوں کے ساتھ مل کر بیرونِ ملک سامراجیوں کو شکست دے سکتا ہوں تو ہم سب مل کر اندرونِ ملک سامراج کے پٹھوؤں کو بھی شکست دے سکتے ہیں"

"میرے بھائیو! اس وقت میری عمر 42 سال ہے اور اس عمر میں مجھے تین باتوں پر فخر ہے۔ اوّل یہ کہ میں نے پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے ملک کو آزاد خارجہ پالیسی دی اور جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو میں نے سلامتی کونسل میں کشمیری عوام کی حمایت کی۔ دوم یہ کہ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ مل کر اس ملک میں آمریت کو شکست دی۔ سوم یہ کہ میں نے ہر ایک گھر' گاؤں' قصبہ اور شہر میں اسلامی مساوات کا پیغام پہنچایا۔ میں اس بات پر غرور نہیں کرتا کہ میں نے ملک کو آزاد خارجہ پالیسی دی لیکن آپ ہی بتائیں کیا اس معاملے میں میرا بھی کوئی ہاتھ تھا یا نہیں؟"

"دوستو! اور بھائیو! 1962ء میں چین اور ہندوستان میں لڑائی ہوئی۔ اس سے قبل ہندوستان فخر سے کہا کرتا تھا کہ ہم غیر جانبدار ہیں اور ہماری سب کے ساتھ دوستی ہے اور ہندو چینی بھائی بھائی ہیں اس وقت ہندوستان کی روس' امریکہ اور چین کے علاوہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ملکوں سے دوستی تھی لیکن جب چین اور بھارت کے درمیان لڑائی ہوئی تو دنیا کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی آئی۔ امریکہ' روس' چین اور دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بھی تبدیلی ہوئی جب چین اور ہندوستان کے درمیان جنگ جاری تھی تو ہمالیہ جل رہا تھا اس وقت موقع تھا کہ پاکستان کچھ فائدہ اٹھا لیتا لیکن ایسے نازک موقع پر ہمارا صدرِ مملکت

ہنزہ چلا گیا۔ جس وقت چینی فوجیں آسام میں داخل ہوئیں ہمارا شہسوار ہنزہ میں خچر پر سوار ہو کر تصویریں اتروا رہا تھا۔ بعد ازاں برطانیہ کے وزیر ڈنکن سینڈز اور امریکہ کے وزیر ایورل ہیری مین بذریعہ طیارہ راولپنڈی پہنچے اور اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ پاکستان کو مسئلہ کشمیر پر بھارت کے ساتھ گفتگو کرنی چاہئے اس وقت ایوب خاں کو دیکھنا چاہئے تھا کہ ہندوستان کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کرے گا جب ہندوستان کو چین سے تکلیف پہنچی تو وہ پاکستان سے مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو گیا حالانکہ آپ نے دیکھا کہ باتوں سے اب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوا اور نہ ہی ہو گا۔ ہمیں اس تجربہ کو یاد رکھنا چاہئے۔ ہندوستان نے جو رویّہ کشمیر کے بارے میں اختیار کیا تھا اب وہی رویّہ فرخا بیراج کے بارے میں اختیار کر رہا ہے حالانکہ اس کا ارادہ اس مسئلہ کو حل کرنے کا سرے ہی نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وقت گزر جائے۔ پاکستان کے حالات اور خراب ہو جائیں۔ اس کے بعد یہ مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا"۔

"دوستو! اور ساتھیو! مسئلہ کشمیر کے بارے میں پہلے ہم کہتے تھے کہ یہ مسئلہ حقِ خود ارادیت کی بنیاد پر حل ہونا چاہئے۔ پھر ہمارا موقف "معنی خیز فیصلہ" ہوا اور پھر "باعزت اور منصفانہ حل"............ میں کہتا ہوں حقِ خود ارادیت کے سوا مسئلہ کشمیر کا کوئی حل ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے۔ ہم اس کا انگ انگ توڑ لیں گے۔ بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے جنگ کے دوران سلامتی کونسل میں امریکی نمائندہ سے کہا تھا کہ جب تک بھٹو پاکستان کا وزیر خارجہ ہے اس وقت تک پاکستان اور بھارت کے تعلقات بہتر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی مسئلہ کشمیر حل ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میں مسئلہ کشمیر کے حل کی راہ میں رکاوٹ ہوں تو میں خودکشی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اس مسئلہ کو حل تو کریں۔ میں ہٹ گیا لیکن اب تک مسئلۂ کشمیر حل نہیں ہوا۔ دراصل ہندوستان جھوٹوں، غاصبوں اور استحصالیوں کا ملک ہے۔ جب تک ہم اس سے مقابلہ نہیں کریں گے مسئلۂ کشمیر حل نہیں ہو گا۔ لوگ کہتے ہیں میں جنگ چاہتا ہوں۔ میں جنگ نہیں چاہتا۔ میں جنگ نہیں چاہتا۔ لیکن میں شکست بھی نہیں چاہتا۔ ہم شکست قبول نہیں کریں گے۔ نہ جنگ نہ شکست مگر ہندوستان کو راہ راست پر لانے کے لئے اس کا ہر قدم پر مقابلہ ضرور کریں گے۔ جب میں وزارت سے مستعفی ہوا تو میرے دوسرے دشمنوں کی طرح بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ بھی بہت خوش تھا لیکن یاد رکھو سردار جی! ذوالفقار علی بھٹو پھر آ رہا ہے ...... بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں جذباتی ہوں اور عوام کے جذبات سے کھیلتا ہوں۔ میں جذباتی نہیں ہوں اور عوام کے

جذبات سے نہیں کھیلتا ہوں۔ لیکن میں ایک غیرت مند مسلمان ہوں"۔

"میرے دوستو اور بھائیو! پاکستان کے خلاف بھارت کی باقاعدہ جارحیت کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اس نے 8 اپریل 1965ء کو جنگ پر سہاری کی اور نیفا میں چین کے ساتھ مقابلہ کرنے والے معروف بریگیڈ کو ہندوستانی حکمران حرکت میں لائے۔ بعد ازاں شاستری نے کنجر کوٹ کو ہندوستان ملکیت قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ پاکستان کو جبر وسے نکل جانا چاہئے کیونکہ یہ علاقہ بھارت کا ہے۔ حالانکہ کنجر کوٹ پاکستان کا علاقہ تھا۔ بلکہ سارا رن کچھ پاکستان کا تھا۔ اس سے پہلے بھارت نے (چھاڑ بیٹ) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان حملوں سے بھارت کے دو مقاصد تھے ایک یہ کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پاکستان پر ان حملوں کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے اور ہندوستان کے خلاف کیا کارروائی کرتا ہے؟ دوسرا یہ کہ وہ اس بات کا اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ پاکستان کے ساتھ چین کے تعلقات کہاں تک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری بہادر افواج نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسے زبردست شکست دی۔ رن کچھ کے علاقے میں زبردست جنگ جاری تھی۔ جنرل ٹکا خاں اور بریگیڈیئر جنجوعہ اس محاذ پر پاکستانی فوج کی قیادت کر رہے تھے اور قریب تھا کہ ہماری افواج کا ایک بریگیڈ ہندوستان کی ایک ڈویژن اور دو بریگیڈ فوج کو تباہ کر دیتا کہ ہمارے شہسوار (ایوب خاں) نے ہماری افواج کو جنگ جاری رکھنے سے منع کر دیا حالانکہ فوج کے کمانڈر پیش قدمی چاہتے تھے لیکن ایوب خاں نے کہا ہم جنگ نہیں چاہتے۔ تعاون چاہتے ہیں۔ اس نے جنگ بند کرا دی اور ثالثی کی تجویز مان لی اور کریم شاہی لے کر خوش ہو گئے"۔

"27 دسمبر 1963ء کو مقبوضہ کشمیر میں حضرت بل کی درگاہ شریف سے موئے مبارک چوری ہوا۔ کشمیری عوام ہندوستانی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان پر بے انتہا ظلم و تشدد ہوا۔ بہت سے لوگ شہید کر دیئے گئے۔ 1964ء میں ہندوستان نے آزاد کشمیر کے علاوہ چکروٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ 1965ء میں اس نے آزاد کشمیر کے مقام کارگل پر قبضہ کر لیا لیکن سلامتی کونسل کی مداخلت پر اسے یہ قبضہ چھوڑنا پڑا۔ مئی 1965ء میں مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ 170 افراد شہید اور 26 زخمی ہوئے اور 419 افراد گرفتار کر لئے گئے۔ 16 اخبار بند کر دیئے گئے لیکن بھارتی قابض حکمرانوں کے خلاف ہنگامے بڑھتے رہے۔ 8 اگست 1965ء کو کشمیری عوام نے بھارتی جبر و استبداد کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔

ہندوستان کا الزام تھا کہ پاکستان سے سات ہزار مجاہدین مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ جنگ بندی لائن پر بھارت کی چھ ڈویژن فوج کی موجودگی میں پاکستان کے مجاہدین مقبوضہ کشمیر میں کیسے داخل ہو گئے؟ وہ جدوجہد کشمیری عوام نے شروع کی تھی۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا تھا اور وہ اس کے خلاف احتجاج کر رہے تھے"۔

"کشمیری عوام کی جدوجہد سے خائف ہو کر بھارتی فوج نے راجوڑی کے علاقے میں کشمیری عوام کے دو گاؤں مکمل طور پر جلا دیئے۔ سرینگر میں مقیم اقوام متحدہ کے نمائندے جنرل نمو نے ہندوستان کے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کے مجاہدین مقبوضہ کشمیر میں داخل نہیں ہوئے اس کے باوجود بھارت نے 23 ر اگست کو پاکستان کے ایک گاؤں اعوان شریف پر بمباری کی جس کے نتیجہ میں 25 پاکستانی شہری شہید ہو گئے۔ 24 ر اگست کو بھارت نے ٹیٹوال اور 25 ر اگست کو درّہ حاجی پیر پر قبضہ کر لیا۔ یکم ستمبر کو پاکستانی فوج نے ان حملوں کا جواب دیا اور چھمب پر قبضہ کر لیا۔ جس وقت بھارتی فوجیں پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر رہی تھیں ایوب خاں سوات میں گاف کھیل رہا تھا۔ میں راولپنڈی سے بذریعہ طیارہ رسالپور پہنچا۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر مردان پہنچا اور وہاں سے ایک اور ٹیکسی لے کر سوات پہنچا۔ والیٔ سوات سے مل کر صدر ایوب کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ گاف کھیل رہے ہیں"۔

"میں نے انہیں بتایا کہ صدرِ محترم! ہندوستان ہمارے خلاف مسلسل جارحانہ کارروائیاں کر رہا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ان کا جواب دینے کا حکم دیں۔ ایوب خاں نے لاپرواہی سے جواب دیا "ہاں! کل موسیٰ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر دی ہے' آپ اس سے بات کریں" میں نے جواب دیا۔ "صاحبِ صدر! میں اس نکمے آدمی سے کیا بات کروں؟ جو فیصلہ کرنا ہے آپ خود کریں۔ اس پر ایوب خاں نے کہا "اچھا تم چلو میں ابھی آتا ہوں"۔ میں پھر والیٔ سوات کے مکان پر پہنچا اور ایک گھنٹہ تک صدرِ مملکت کا انتظار کرتا رہا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ لباس بدل کر تشریف لائے' تو میں نے کہا اگر ہم نے بھارتی حملوں کا جواب نہ دیا تو بھارت آزاد کشمیر پر قبضہ کر لے گا اور پھر پاکستان پر بھی حملہ کر دے گا۔ اس پر ایوب خاں کچھ فکرمند ہو گیا اور اس نے مجھے کہا "اچھا رات کو کھانے پر بات ہو گی"۔ میں نے پھر کہا اگر ہم نے جوابی کارروائی نہ کی تو ہمارا ملک تباہ ہو جائے گا۔ والیٔ سوات نے میری تائید کی اور کہا "آپ کا وزیر خارجہ صحیح کہہ رہا ہے آپ کو ہندوستان کی جارحیت کا جواب دینا چاہیے"۔ اس

پر ایوب خاں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اچھا تم جاؤ اور موسیٰ سے کہو کہ وہ جوابی کارروائی کرے" ۔ میں راولپنڈی پہنچا اور موسیٰ سے ملا اور کہا کہ صدر نے مجھے حکم دیا ہے کہ ہندوستان کی جارحیت روکنے کے لئے جوابی کارروائی کرو۔ اس پر موسیٰ خاں نے جواب دیا "میں صدر سے خود بات کروں گا" ۔

"جب ہماری بہادر فوج کو جوابی کارروائی کا حکم ملا تو اس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہماری فوجیں مسلسل آگے بڑھ رہی تھیں اور اکھنور صرف چار میل دور تھا۔ اگر پاکستانی فوج اکھنور پر قبضہ کر کے جموں کو کاٹ دیتی تو ہندوستان کی چھ ڈویژن فوج بالکل تباہ ہو جاتی۔ ہمارے موجودہ عارضی صدر یحییٰ خاں نے جو اس وقت ٹیٹو شو دیکھ رہے تھے مجھے کہا "ہمیں اکھنور پر قبضہ کر لینا چاہیئے" ۔ میں نے کہا ضرور قبضہ کریں۔ یحییٰ خاں اس محاذ کے انچارج تھے اور وہ اکھنور پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن ایوب خاں نے حکم دیا کہ "فوجیں واپس کرو اور لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں کی حفاظت کرو" ۔ جنرل یحییٰ خاں نے ایوب خاں کو یقین دلایا تھا کہ جب تک ہندوستانی فوجیں لاہور اور سیالکوٹ کی سرحدوں پر پہنچیں گی اس وقت تک پاکستانی فوجیں اکھنور پر قابض ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان میں پاکستان کے سفیر مسٹر ارشد حسین نے بھی اس خیال کی تصدیق کی تھی لیکن ایوب خاں نے یہ بات نہ مانی"

میرے دوستو اور بھائیو ! ہماری بہادر افواج 23 ر ستمبر کو آگے بڑھنے کے لئے تیار تھیں۔ چین نے ہندوستان کو الٹی میٹم دے دیا تھا۔ چین نے ہماری مدد کی۔ ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ ایران نے ہماری مدد کی۔ آفرین ہے شہنشاہ ایران پر ' جو آجکل ہمارے مہمان ہیں ' کہ انہوں نے ہماری مدد کی۔ آفرین ہے ترکی پر ' ہم احسان مند ہیں صدر سوئیکارنو کے۔ سوئیکارنو نے مجھے کہا تھا "ہماری ساری فوج آپ کی ہے۔ جو کچھ ہے آپ لے جایئے اور پاکستان کی حفاظت کیجئے۔ کھیم کرن کے محاذ پر ہمارا کافی نقصان ہوا۔ ہماری بہادر فوجیں دو مرتبہ امرتسر کے نواح میں پہنچ چکی تھیں لیکن دونوں بار انہیں واپس بلا لیا گیا۔ جنرل یحییٰ خاں ایئر مارشل نور خاں اور پاک فضائیہ کے موجودہ کمانڈر انچیف ایئر مارشل رحیم سب کے سب ہندوستان کو سبق دینا چاہتے تھے لیکن موسیٰ خاں اور ایوب خاں پریشان تھے۔ اس وقت میں سلامتی کونسل سے اعلان کر رہا تھا کہ ہم ایک ہزار سال تک لڑیں گے اور ادھر ایوب خاں اور موسیٰ خاں کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ میں موسیٰ خاں کے پاس گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور مجھے کہنے لگا "کہاں ہے چین ؟ ' کہاں ہے چین ؟ اسے بلاؤ !" میں نے موسیٰ سے

کہا موسیٰ خاں! تم اپنی پتلون خراب نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بعد میں جنرل موسیٰ نے ایوب خاں سے یہ شکایت بھی کی تھی کہ وزیر خارجہ نے مجھے کہا تھا کہ تم اپنی پتلون خراب نہ کرو"۔

"میں نے اسی روز چین کے سفیر کو طلب کیا اور اسے کہا کہ ہم جارحیت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا مقابلہ ایک ظالم اور اپنے سے چھ گنا بڑے دشمن سے ہے۔ آپ کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ بین الاقوامی معاملات میں صرف حق کا ساتھ دیتی ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ آپ اپنے اس موقف کے حق میں کیا ثبوت دیں گے اور ہماری کیا مدد کریں گے۔ چینی سفیر نے کہا جب چین کوئی قدم اٹھائے گا تو دنیا ہل جائے گی۔ دو دن بعد رات کے دو بجے چینی سفیر نے مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ " آپ کے نام عوامی جمہوریہ چین کے صدر کا ایک ضروری پیغام ہے" میں نے جواب دیا آپ مجھے صبح پانچ بجے ملیں کیونکہ سات بجے صدارتی کابینہ کا اجلاس تھا اور میں چاہتا تھا کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے ساتھ بات چیت کر لوں۔ چینی سفیر پانچ بجے تشریف لے آئے اور انہوں نے مجھے کہا " آپ نے مجھے کہا تھا کہ چین اپنا فرض کیسے ادا کرے گا" تو سنو نوجوان! ہم نے ہندوستان کو الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگر اس نے ہمارے 30 خچر فوری طور پر واپس نہ کئے تو ہم تین اطراف سے ہندوستان پر چڑھائی کر دیں گے۔ نیفا سے آسام پر قبضہ کر لیں گے۔ لداخ سے سرینگر پر حملہ آور ہوں گے اور بیچ سے دہلی پر قبضہ کر لیں گے"۔

"چین کے الٹی میٹم سے ہندوستان کانپ اٹھا اور برطانیہ کے سفیر ہمارے "سیاست دان" (ایوب خاں کی طرف اشارہ ہے) سے ملے اور کہا کہ "اگر چین نے پاکستان اور بھارت کی جنگ میں مداخلت کی تو ایٹمی جنگ چھڑ جائے گی"۔ میں نے کہا ایٹمی جنگ تو اب تک ویت نام میں شروع نہیں ہوئی اور پھر ہم تو سیٹو اور سنٹو کے ممبر ہیں۔ کیا آپ ہم پر بھی ایٹم بم پھینکیں گے؟ لیکن ایوب خاں اس صورت حال سے گھبرا گیا اور اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں چین سے ہندوستان کو دیا جانے والا الٹی میٹم واپس لینے کے لئے کہوں۔ میں نے چینی سفیر کو دوبارہ طلب کیا اور اسے ایوب خاں کی خواہش سے آگاہ کیا اور کہا کہ ہندوستان کو دیا جانے والا الٹی میٹم چین واپس لے۔ اس پر چینی سفیر بہت حیران ہوا اور کہنے لگا آپ لوگ کیا چیز ہیں۔ کبھی کہتے ہو ہندوستان کو الٹی میٹم دو کبھی کہتے ہو الٹی میٹم واپس لو۔ میں نے کہا صدرِ مملکت کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر چین نے پاک بھارت جنگ میں مداخلت کی تو ایٹمی جنگ چھڑ جائے

گی۔ چینی سفیر نے کہا "ہم ایک بہادر قوم ہیں۔ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو ایٹم بم پاکستان پر نہیں بلکہ چین کے سینے پر گریں گے"۔

"میرے دوستو اور ساتھیو! جنگ کے بعد ایوب خاں نے امریکہ اور برطانیہ کے نمائندوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کے لئے بھٹو کو سلامتی کونسل میں نہیں بھیجیں گے لیکن وزیر قانون ایس ایم ظفر نے نیویارک سے صدر کو ٹیلی فون کیا کہ سلامتی کونسل میں بھٹو کی سخت ضرورت ہے۔ میں نے صدر سے کہا میں اس ملک کا وزیر خارجہ ہوں۔ مجھے عوام کو جواب دینا ہے۔ اس لئے مجھے وہاں جا کر پاکستان کی نمائندگی کرنی چاہئے۔ اب تو چین نے بھی الٹی میٹم روک لیا ہے۔ اب مجھے جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں نے صدر سے کہا اگر میں نے سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کا فرض ادا نہ کیا تو میں اور آپ پاکستان کے عوام کو کیا جواب دیں گے۔ سارے دن کی بحث کے بعد شام کے سات بجے نیویارک جانے کی اجازت ملی اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو پر میری روانگی کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ جنگ کے دنوں میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ میں جب طیارے میں نیویارک جا رہا تھا۔ ہندوستان اسے گرا کر تباہ کر دینا چاہتا تھا لیکن اللہ تعالٰی کی مہربانی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ دوسری صبح نو بجے میں نیویارک پہنچا۔ میں نے پاکستانی وفد کا اجلاس طلب کیا اور ارکان سے پوچھا کہ مجھے سلامتی کونسل میں تقریر کرنی چاہئے یا نہیں۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر امجد علی نے جو ضرورت سے زیادہ موٹے تھے، گردن گھما کر نفی میں جواب دیا اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب آغا شاہی نے ...... جو "آغا" بھی ہیں اور "شاہی" بھی ...... میری تقریر کی مخالفت کی لیکن میں نے کہا کہ مجھے اقوام عالم کے کانوں تک پاکستان کے عوام کی آواز کو پہنچانا ہے۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے ساتھ کتنا ظلم ہوا ہے"۔

"میرے بھائیو! آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے سلامتی کونسل میں آپ کے دکھ درد اور قربانیوں کا ذکر کیا۔ آپ کی بہادر افواج نے مقابلہ کیا۔ عوام نے قربانیاں دیں اور فتح پاکستانی عوام کی ہوئی آئندہ بھی انشاء اللہ اسی طرح عوام کامیاب رہیں گے۔ جنگ کے بعد ایوب خاں واشنگٹن گئے اور صدر جانسن سے ملاقات کی۔ جانسن نے ایوب خاں کو بہت ڈرایا دھمکایا اور اپنے گھٹنوں پر گرنے پر مجبور کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ پاکستان کی بہادر قوم کا سربراہ مملکت اتنی آسانی سے مرعوب ہو گیا۔ حالانکہ اس سے دو ماہ قبل 2 اکتوبر کو جب امریکی وزیر خارجہ ڈین رسک نے میری موجودگی میں روسی وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو سے کہا کہ

گذشتہ 18 سال سے ایک کتا (پاکستان) ہماری ایک ٹانگ کاٹ رہا ہے اس وقت امریکی وزیر خارجہ کو مجھے جواب دینا پڑا اور میں نے کہا مسٹر ڈین رسک اب ہم ذرا ٹانگوں سے کچھ اُوپر کاٹیں گے"۔

"میرے بھائیو! ہم مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ایوب خاں پگھل گیا۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ اس لئے کہ میرے دل میں پاکستانی عوام کا درد تھا۔ میں ایک مسلمان تھا۔ ایوب خاں خودغرض تھا راشی تھا۔ اس نے قوم سے غداری کی ہے۔ بعد میں تاشقند میں ایوب خاں نے قومی مفادات سے غداری کی۔ تاشقند میں کیا ہوا؟ آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ ایوب خاں سے پوچھئے۔ میں نے تو اعلانِ تاشقند کی مخالفت کی تھی" .... (اس موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی کی اصولی کمیٹی کے رکن ڈاکٹر مبشر حسن نے اعلان تاشقند کے بارے میں ور گاداس کی کتاب "بھارت کرزن سے نہرو تک" سے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ کتاب میں لکھا ہے :۔

"وزیر خارجہ بھٹو نے عہدنامہ کے روسی مسودے پر طرح طرح کے اعتراضات اٹھا کر سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت بھی جب ایوب خاں نے خود اپنے ہاتھ کی تحریر میں "طاقت کے عدم استعمال" کو معاہدے میں شامل کرنا مان لیا تھا۔ بھٹو نے ان الفاظ کو مسودے سے نکال دیا جو پاکستانیوں نے روسیوں کو بھیجا۔ اس پر روسی بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بھٹو کی ایک نہ چلنے دیں گے۔ اس کو اب وہ "گاریاچی گلاوہ" یعنی خودسر اور جذباتی کہتے تھے۔ انہوں نے کامیابی سے بھٹو کے منصوبہ کو اس طرح خاک میں ملایا کہ وہ سیدھے ایوب کے پاس گئے اور کہا کہ تم اپنی پہلی مانی ہوئی بات پر قائم رہو۔ اس واقعہ کے بعد تاشقند میں بھٹو کی حالت قابل رحم تھی۔ اس شاندار تقریب میں جہاں معاہدے پر دستخط ہوئے' جو لوگ موجود تھے انہوں نے دیکھا کہ ایوب نے اسے بُری طرح ڈانٹا' جبکہ وہ اپنے منہ سے دھوئیں کے چھلے نکال رہا تھا اور اس کا رویہ ایسا تھا جو موقع کی مناسبت سے نامناسب تھا۔ لڑائی سے کچھ پہلے بھٹو نے ہندوستانی ہائی کمشنر سے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ ہم ہندوستان سے نہیں ڈرتے۔ اس ملک کی موت قریب ہے۔ اس کے اندر ناسور پھیل رہے ہیں اور یہ ملک جلد ہی انتشار کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ہندوستان میں کوئی استحکام نہیں"۔ ہائی کمشنر نے جواب دیا کہ جناب وزیر خارجہ صاحب! اگر ہندوستان اپنی پالیسی اس مفروضے پر بنائے کہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو

رہا ہے تو یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہوگی اس لئے آپ بھی ایسا فرض نہ کریں"

....

ابھی ڈاکٹر مبشر یہاں تک ہی پڑھ پائے تھے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گرجتے ہوئے کہا..... "پاکستان کو دنیا کی کوئی طاقت ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتی۔ ہم پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔ ہم ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں گے"۔

قاتلانہ حملہ

4 ر اکتوبر 1970ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ناصر باغ لاہور میں جلسہ عام سے خطاب کے دوران کہا "تین سال گزرے میں نے ایوب خان کے دور میں اسی گول باغ میں تقریر کی تھی۔ اُس وقت میں اور اِس وقت میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس روز رات تھی اور اب دوپہر ہے۔ اُس وقت ایوب خان کی حکومت تھی اور اِس وقت یحییٰ خان کی حکومت ہے۔ اُس وقت بھی میں نے بُرے وقت میں تقریر کی تھی اور اِس وقت بھی بُرے وقت میں تقریر کر رہا ہوں۔ اُس وقت بھی لوگ میرے ساتھ تھے اور اِس وقت بھی لوگ میرے ساتھ ہیں۔ اُس وقت ایوب خان نے ہمارے ساتھ کیا کیا سختیاں نہ کی تھیں۔ اِسی گول باغ میں پانی کا پائپ توڑا گیا۔ پانی چھوڑا گیا اور پانی میں بجلی کا کرنٹ چھوڑ کر لوگوں کو شاک لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُس وقت بھی کوشش کی گئی تھی کہ ہمارے جلسے کو درہم برہم کیا جائے۔ آخر اس جلسے کو درہم برہم کرنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ لوگ ہم کو روکنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم رُک جائیں۔ جلسے نہ کریں، تقریریں نہ کریں۔ پاکستانی عوام کو سچی باتیں نہ بتائیں اُن کے مفاد کی باتیں نہ کریں۔ ملک کی اندرونی اور بیرونی سلامتی کی باتیں عوام کو نہ بتائیں۔ اُن لوگوں کا مقصد صرف گول باغ کے جلسے کو درہم برہم کرنا نہ تھا۔ اُن کا بنیادی اور اہم مقصد صرف ہمیں روکنا تھا۔ اب بھی آپ سن رہے ہیں کہ چند سیاست دان کہہ رہے ہیں

وزیراعظم بینظیر بھٹو اور جنرل اسلم بیگ سیاچن کے دورے پر

وزیراعظم بینظیر بھٹو اور نیول چیف یستورالحق

وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو گارڈ آف آنر لیتے ہوئے

محترمہ بینظیر بھٹو سلامی کے چبوترے پر

وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو کو فوج کا سلیوٹ

سر! میں تو آپ کا خادم ہوں

مذاکرات جو فوج نے ناکام بنا دیے

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق اور میجر جنرل اختر عبدالرحمٰن آفیسرز میس مری 1976ء

مصری فوج کے چیف آف سٹاف، پاکستان کے چیف آف سٹاف، وزیراعظم پاکستان

ذوالفقار علی بھٹو فوج سے اقتدار لیتے ہوئے

سابق فیلڈ مارشل ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو

جانے کو کہا اس وقت تو آپ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم مخالفت کر رہے ہیں آخر ہمارے ہی لوگ اور جان نثار کیوں پکڑے گئے ایک سال قبل کیا آپ کی تجویز کی تعریف ہو رہی تھی؟ نہیں! نہیں! آپ کو معلوم تھا کہ لڑائی اور جدوجہد 'اقتصادیات اور خارجہ پالیسی پر ہے اس وقت بھی آپ نے ہم کو روکنے کی کوشش کی اور 12 ر اگست کو پانچ فوجی افسر جن میں ایک بریگیڈیئر تھا میرے پاس بھیجے۔ انہوں نے مجھے کہا آپ کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا ہے۔ میں نے کہا "میں نہیں آتا" .... اگر مجھے عوام کے لئے جانا ہے تو میں لاکھ مرتبہ جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ بات کرنا چاہتے ہیں تو میرے مکان پر آئیں ..... اس وقت ان افسروں نے کہا کہ آپ کو راولپنڈی طلب کیا گیا ہے میں نے کہا اگر مجھے بلایا گیا ہے تو میں نہیں جاتا اور اگر یہ دعوت ہے تو دوسری بات ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ دعوت ہے"۔

"یہ سب حرکتیں اس وقت شروع کی گئیں ایوب خاں نے جو کیس ہمارے خلاف بنائے وہ آپ نے شروع کئے۔ اس کے علاوہ آپ کی حکومت نے اس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جس نے ایوبی دور میں ہمارے خلاف چھوٹا کریکٹر کیس بنایا تھا لاڑکانہ ہی میں رکھا جو کیس ایوب خاں راولپنڈی میں شروع کرنے کی ہمت نہ کر سکا وہ آپ نے شروع کئے اس وقت آپ کہاں تھے جب 28 ر نومبر کو ہمیں صادق آباد میں مارنے کی کوشش کی گئی۔ ہماری موٹروں پر پتھراؤ کیا گیا اور میرے دوست امان اللہ خان زخمی ہوئے جو اس وقت جیل میں ہیں۔ اس وقت 30 حملہ آور افراد گرفتار کئے گئے لیکن ان میں سے 25 افراد کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا اور یہ مارشل لاء کے قانون کے مطابق کیا گیا جب میں نے یہ خبر پڑھی تو مجھے یقین نہ آیا اور میں نے جنرل عثمان مٹھا کو فون کر کے پوچھا کہ کیا کیا؟ جن لوگوں نے ہم پر حملے کئے ان کو چھوڑ دیا۔ ان چوروں' بدمعاشوں کو جو دوپہر کے وقت ہمیں مارنے آئے کیا سزا دی گئی صرف دو ماہ قید"۔

"آخر 31 ر مارچ کو ہم نے کیا جرم کیا تھا؟ ہم اس روز سندھ کا ایک سیاسی دورہ کر رہے تھے۔ وہ ایک نہایت کامیاب دورہ تھا ہم سانگھڑ جا رہے تھے۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے تھے لیکن ہمارے مخالف رائفلوں اور مشین گنوں سے مسلح چھپے بیٹھے تھے اور اس روز پاکستان میں جو غنڈہ گردی ہوئی اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پانچ ہزار مسلح افراد مورچوں میں بیٹھے تھے اور انتظامیہ کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے"۔

"اس وقت ڈپٹی کمشنر اور ایس پی میرے پاس آئے اور مجھے سرکٹ ہاؤس جانے کو کہا

اس وقت اگر ہم سرکٹ ہاؤس چلے جاتے تو قتل کر دیئے جاتے کیونکہ مسلح حُروں نے سرکٹ ہاؤس کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ مارشل لاء کے دور حکومت میں سات آٹھ ہزار افراد ہماری میں چالیس کاروں کو روکنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ وائرلیس چل رہے تھے۔ سرکٹ ہاؤس کو حُروں نے گھیر رکھا تھا۔ سرکٹ ہاؤس کے باورچی خانے تک میں مسلح حُر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمیں کہا جا رہا تھا کہ سرکٹ ہاؤس چلے جائیں۔ اس وقت اللہ نے ہمیں بچایا۔ میں نے موٹر سے اُتر کر ان لوگوں سے کہا کہ عوام کو کیوں مارتے ہو اگر مارنا ہے تو مجھے مارو۔ اس وقت گولیاں بھی چلیں۔ تقریباً 20 راؤنڈ چلائے گئے۔ لوگ مجھ پر گرے اور اس طرح میں بچا۔ قاضی نامی ایک اے ایس آئی اور ایک سب انسپکٹر نے گواہی دی کہ مجھ پر حملہ کیا گیا اور گولیاں چلائی گئیں۔ سانگھڑ میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن ریڈیو پر خبر نشر نہ ہوئی۔ ریڈیو پر صبور خان کی خبر نشر ہوئی کہ انہوں نے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان میں مچھروں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ غیر ممالک کے ریڈیو سٹیشنوں نے اس خبر کو اہمیت دی اور خبروں کے بلیٹن میں یہ خبر سب سے پہلے سنائی لیکن ریڈیو کراچی سے جب یہ خبر نشر ہوئی تو چھٹے نمبر پر سنائی گئی"۔

مسٹر بھٹو "عظیم المیہ" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"جب 1971ء کے عظیم المیے کا طوفان تھم جائے گا اور جب مسرپی حصے کے سیاستدان احساسِ شکست اور ندامت کو دُور کر دیں گے اور جب مشرقی بازو میں وہ نفرت دور ہو جائے گی جو عوامی لیگ نے انتخاب کے بعد ہمارے خلاف پھیلائی اس وقت اس بحران کو دور کرنے کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آئے گا اور اس وقت اس بات کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے کس طرح مسلسل یہ کوشش کی کہ پاکستان کو درپیش سنگین مسائل کا منصفانہ تصفیہ ہو جائے اور کس طرح مفاد پرست عناصر نے ہر موقع پر اپنی گھناؤنی سازش کے ذریعے ہمیں ناکام بنایا"۔

"اس عظیم المیے نے پاکستان کو تقریباً تباہی کے قریب کر دیا ہے اب ہمیں چاہئے کہ ہم حتی الامکان ایسے آخری سانحے کو روکنے کی کوشش کریں جو بدقسمتی کو اپنے ساتھ لائے گا لیکن صورت حال کی نزاکت کا احساس کرنے 'فاتح پارٹی کے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے سازشیں کرنے والے اب بھی پاکستان کو بچانے کے لئے ہماری کوششوں کو ناکام بنانے میں مصروف ہیں انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم رجعت پسند طاقتوں کو پاکستان کے خاتمے کی کسی

طرح بھی اجازت نہیں دے سکتے"

"مسٹر بھٹو نے کراچی کے نشتر پارک میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"تاریخ کا انتظار کرو۔ تاریخ سب مجرموں کو ننگا کر دے گی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے ذمہ دار تاریخ کی تیز دھاری تلوار کے نیچے آجائیں گے"

جناب بھٹو نے جیل سے فرانس کے صدر جسکارڈ کے نام اپنے خط میں لکھا "وادی سندھ کی تہذیب بڑی قدیم اور پُروقار ہے لیکن اس وقت یہ وادی ایک بیمار پانی سے سیراب ہو رہی ہے کہ یہاں کے باشندوں کو خوف اور دہشت کی بہت لمبی راتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آزادی سے لے کر اب تک یہ ملک تین بار فوجیوں کی حکومت کے تجربے سے گزرا ہے۔ ہر کامیاب فوجی بغاوت اس ملک کو پہلی فوجی بغاوت کے دور سے بھی کمزور تر کرتی رہی ہے۔ اگر یہی حادثے بھارت کو پیش آتے تو وہ اب تک تین یا چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ جی ہاں' لاقانونیت تو ہندوستان میں بھی ہے لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ ان کا برُے سے برُا سیاست دان بھی ہمارے ڈکٹیٹروں سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

.... یہ پُر اسرار بندے

فوجی حکومت نے جناب ذوالفقار علی بھٹو پر سنگین نوعیت کے الزامات پر مشتمل ایک وائٹ پیپر جاری کیا جس کا جواب بھی انہوں نے جیل میں لکھا۔ جناب بھٹو لکھتے ہیں "ماضی میں جدوجہد کے فیصلے میدان جنگ میں ہوا کرتے تھے۔ اب یہ لڑائیاں پارلیمنٹ میں لڑی جاتی ہیں۔ 61-1960ء کے موسم سرما میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کے وزیر خارجہ وان برینتانو پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ اس وقت کے وزیر خارجہ منظور قادر اور مجھے ان کی صدر ایوب سے ملاقات کے دوران موجود رہنے کو کہا گیا۔ اکثر امور پر اتفاق رائے پایا گیا۔ صدر ایوب کے الوداعی کلمات یہ تھے .... "پاکستان بھی جرمنی جیسی روایات کا ملک ہے"۔ وان برینتانو جو اطالوی پس منظر رکھنے والے جرمن ارسٹو کریٹ تھے اور شاید دونوں ملکوں کی مشترک اقدار اور روایات سے واقف نہ تھے کہنے لگے "میرے لئے یہ ایک دلچسپ اطلاع ہے"۔ صدر ایوب نے یہی فقرہ بون میں چانسلر کونارڈ ایڈناور اور وزیر خارجہ شرائڈر سے بھی دہرایا۔ لاہور میں سمندر پار ممالک سے متعلق اقتصادی امور کے جرمن وزیر والٹرشیل (جو بعد میں مغربی جرمنی کے صدر رہے) سے بھی انہوں نے یہی بات کہی۔ ایوب خان کوئی عام آدمی نہ تھا۔ وہ نو دس سال تک پاکستان کی افواج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ کیا سبب تھا جس کے باعث وہ سمجھتا تھا کہ یہ مشابہت اس قدر اہم ہے کہ ہر جرمن رہنما سے اس کا تذکرہ کیا جائے؟"

"نپولین بوناپارٹ سے پیچھا چھڑا لینے کے بعد' یورپ کے شہنشاہ اور بادشاہ آسٹروی ہنگرین ریاست کے دارالحکومت ویانا میں جمع ہوئے تاکہ یورپ میں امن واستحکام کے لئے ایک معاہدے پر دستخط کر سکیں۔ یہ ارسٹوکریٹوں (اشرافیہ) کا عہد تھا۔ یہ طبقہ 1789ء کے انقلاب فرانس سے جانبر ہو چکا تھا اور واٹرلو میں نپولین کو شکست دے چکا تھا۔ اس امر پر یقین پختہ ہونے کے بعد کہ تاریخ نے یورپ کے "خالص خون" کو ابدی حکمرانی کے لئے چن لیا ہے۔ انہوں نے "سٹیٹس کو" کی تشکیل دے دی۔ آسٹریا کا شہزادہ میٹرنک اس معاہدے کا روحِ رواں تھا۔ فرانس کے ٹیلی رینڈ کی بے مثال ذہانت اور برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کاسٹرلی سے مل کر اپنے لئے بہترین شرائط منوانے کی کوششوں کے باوجود شہزادہ میٹرنک نے ستمبر 1815ء میں ایک عظیم الشان تقریب میں یورپ کے نئے نظام کو نافذ کر ہی دیا'۔

"ویانا کی کانفرنس میں "میثاقِ ویانا" طے پایا تھا جس میں بادشاہ کو ریاست قرار دیتے ہوئے اشرافیہ کو خصوصی مراعات اور وسائل دیئے گئے تھے یہ آمریت اور جاگیرداری کا ایک آمیزہ تھا جس پر نومولود سرمایہ داری کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا"

"عوام کا نمبر سب سے آخری تھا اور وہ اشرافیہ اور کلیسائیت دونوں کے ظلم کا نشانہ تھے 26، ستمبر 1815ء کو روس' جرمنی اور آسٹریا نے "مقدس اتحاد" پر دستخط کئے مگر پندرہ برس کے اندر اندر عوام پھر باہر نکل آئے تھے۔ 1848ء تک مشرقی یورپ کی تقریباً تمام اقوام عَلمِ بغاوت بلند کر رہی تھیں۔ انقلاب کی آمد آمد تھی مازینی اور لوئی کوسوتھ جیسے رہنما عوام کی رہنمائی اور ولولہ انگیزی کے لئے سامنے آچکے تھے۔ ویانا میں بہت احتیاط سے طے پانے والا سمجھوتہ مٹی میں مل چکا تھا اور اس کا معمار شہزادہ میٹرنک لندن کو فرار۔ بعدازاں بنجمن ڈزرائیلی نے اپنی بیوی اور داشتہ کو اطلاع دی تھی کہ میٹرنک سراسر بور آدمی ہے"۔

"یورپ کے انقلاب کے بھنور میں پھنسے ہوئے جرمن امیرزادوں نے اپنی فوجوں کی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جرمن فوج' جرمنی کے وسائل سے کہیں زیادہ پھیل چکی تھی۔ یہ واضح تھا کہ جرمنی کا رقبہ اور وسائل اس فوج کا بوجھ زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکیں گے۔ صورت حال اس قدر بگڑ گئی کہ یہ کہا جانے لگا "جرمنی ایک فوج ہے جس کے پاس ایک ملک ہے نہ کہ ایک ملک جس کے پاس فوج"۔ جرمن امیرزادے نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کے سامنے تین متبادل تھے (1) جرمنی کی سلطنت وسیع کر دی جائے اور جرمن مادرِ وطن اس سلطنت کا مرکز ہو۔ (2) اس سفید ہاتھی فوج میں کمی کی جائے یا (3)

جرمن سلطنت اپنی ہی فوج کے بوجھ تلے پس کر رہ جائے۔ جرمن سلطنت نے اس مسئلہ کا حل تین توسیع پسندانہ جنگوں میں کیا۔ پہلی جنگ 1864ء میں ڈنمارک کے خلاف لڑی گئی۔ دوسری جنگ 1866ء میں آسٹریا کے خلاف اور تیسری 71-1870ء میں فرانس کے خلاف۔ ان جنگوں کی منصوبہ بندی شہزادہ اوٹووان بسمارک نے کی اور ان پر عملدر آمد غیر معمولی ذہانت کے مالک جنرل وان مولٹکے نے۔ فرانس سے جنگ کے خاتمے پر جرمنی کے "اتحاد" کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ یقیناً جرمن سلطنت نے اپنی فوج کے ذریعے اپنے فوجی بجٹ کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ 18 جون 1871ء کی فتح کے نشے میں سرشار بسمارک نے جنرل وان مولٹکے اور دوسرے سیاست دانوں اور جرنیلوں کی معیت میں ایک عظیم الشان تقریب میں اعلان کیا "اے سلطنت اے بیزرز کام مکمل ہو چکا ہے"۔

پاکستان بھی جرمن سلطنت کی طرح ایک بہت بڑی باقاعدہ فوج کا مالک ہے۔ پاکستان نے بھی تین جنگیں لڑی ہیں 1948ء، 1965ء اور 1971ء میں اور وہ "عظیم الشان تقریب" ڈھاکہ ریس کورس 17 دسمبر 1971ء کو منعقد ہوئی جس میں جنرل ٹائیگر نیازی نے شرکت فرمائی جنرل وان مولٹکے کی تقریب کے ایک صدی بعد "کام مکمل ہو چکا ہے" ایوب خان نے غلط تو نہیں کہا تھا"۔

قومی مفادات کے تقاضے ذاتی اغراض کی تشہیر سے پورے نہیں ہوتے میں نے ہمیشہ عظیم قومی مفادات کی تکمیل کی کوشش کی ہے میں نے مسلح افواج کے وقار اور شہرت کو بچانے کیلئے مشکلات بھی جھیلی ہیں۔ اب بھی میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ (1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بارے میں) پر کھلے بندوں تبصرہ کرنے سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ اس سے مسلح افواج کے نام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے چنانچہ سنگین اشتعال انگیزیوں اور غیر انسانی سلوک کے باوجود میں اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ وائٹ پیپر میں حمود الرحمٰن رپورٹ کے بارے میں دو جگہ نمایاں حوالے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح نیکی کو بدی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"اس رپورٹ میں یحییٰ خان اور اس کے ٹولے کی گھناؤنی سازش کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ بنگال کا نقشہ سرخ رنگ میں رنگا گیا اس جنرل کی ہدایت پر جس کی جان اور عزت میں نے بچائی مگر جو جام صادق علی کو میرے خلاف قتل کے مقدمہ میں وعدہ معاف گواہ بننے پر آمادہ کرنے کیلئے لندن تک گیا۔ وائٹ پیپر کے صفحہ 106 پر کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ پر عوام میں شور شرابے سے

مجبور ہو کر میں رپورٹ شائع کرنے پر غور کر رہا تھا مگر مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ اس بارے میں کوئی یک طرفہ فیصلہ کرنے سے پہلے مزید سوچ بچار کر لوں وائٹ پیپر کا یہ پیرا نمایاں طریقے سے شائع کیا گیا ہے اور یوں ہے۔

"بحث کے بعد یہ طے پایا کہ 1971ء کی جنگ اور اس سے قبل کے واقعات کی جو حمود الرحمٰن رپورٹ کے دائرہ کار سے باہر ہیں، کشمیر سے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے اور رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ اور بھی زور پکڑ جائے گا اور منفی نتائج بر آمد ہوں گے۔ اس لئے وزیر اعظم سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلے پر نظر ثانی فرمائیں"۔

صفحہ نمبر 107 پر کہا گیا ہے۔

دوسرا گرما گرم موضوع "1971ء کی جنگ اور اس سے پہلے کے واقعات" کا تھا طے یہ ہوا کہ حمود الرحمٰن رپورٹ سے باہر کوئی نئی توضیح نئے مسائل کو جنم دے گی، رپورٹ کی اشاعت کے مطالبے کو تقویت بخشے گی اور منفی نتائج کی حامل ہوگی جناب بھٹو نے اس لائحہ عمل سے اتفاق کیا اور مختصراً اتنا کہا "ہاں" اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے"۔

"صفحہ نمبر 107 کا پیراگراف اس سے پہلے والے حوالے ہی کی تکرار ہے مگر اس میں سفارش سے میرے اتفاق کا ذکر بھی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مسلح افواج کی عزت کے تحفظ کے لئے ہی میں نے اپنے سیاسی مفادات کی قربانی دی تھی اور اس کا کیا خوب صلہ مل رہا ہے۔ بجائے میرا شکر گزار ہونے کے "نیکی برباد گناہ لازم" کی اذیت پسندانہ کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ہے "اِدھر ہم اُدھر تم" کا اصل مطلب، وہ فقرہ جو اس مسخ شدہ شکل میں ہے، میں نے کبھی استعمال نہیں کیا مگر جو بہر حال ثابت ہوا۔ اُدھر بنگالیوں کی شامت آئی اور اِدھر ہماری اُدھر بنگالی سیاستدانوں کو حکمرانی کے نااہل سمجھا گیا اِدھر ہمیں۔ اِدھر بھی جمہوریت ناقابلِ عمل تھی اُدھر بھی جمہوریت ناقابلِ عمل قرار پائی۔ اِدھر بھی سرمایہ دار عوام کا استحصال کرتے رہے اُدھر بھی یہی حال رہا اُدھر بھی بنگالیوں کو اقتدار اعلیٰ کی بجائے ڈنڈا ملا اور اِدھر بھی ڈنڈا ہمارا مقدر ٹھہرا یعنی "اِدھر ہم اُدھر تم"

"چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے کوئٹہ ایئرپورٹ پر میرے ساتھ 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں سامنے آنے والی تین قوتوں والے بیان کا حوالہ دیا ہے اس پر میں پہلے بھی

تبصرہ کر چکا ہوں۔ اگر چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر میری ان تنبیہوں کا حوالہ دینے کی تکلیف فرماتے جو میں نے پاکستان کی سیاست میں فوج کے کردار کے بارے میں دی تھیں تو یہ موجودہ بحران سے زیادہ متعلق ہوتا جنرل ضیاء الحق کو بھی بتانا چاہئے تھا کہ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا۔

"اس بحران کا ناگزیر سبق یہ ہے کہ عوام کو حکومت میں شرکت کا موقع دیا جائے اس وقت جب مشرقی پاکستان میں فوج کی کارروائی جاری ہے' مغربی پاکستان میں مایوسی بڑھ رہی ہے اور موجودہ فوجی حکومت اب اس بحران کو نظر انداز کر کے اپنے فوجی شاہانہ اقتدار کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ صرف ایک حقیقی نمائندہ حکومت جسے عوام کا مکمل اعتماد اور تعاون حاصل ہو ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کا ایمان ہے کہ عوام کی نمائندہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ فرض بھی ہے کہ عوامی نمائندوں کو فوری انتقالِ اقتدار کا مطالبہ کرے۔ اگر فوجی حکومت سے اقتدار کی منتقلی میں تاخیر ہوئی تو چند ماہ میں ہی ملک ایک ایسے مقام پر پہنچ جائیگا جہاں سے واپسی ناممکن ہو گی"۔ (عظیم المیہ)

"جنرل کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ 29 ستمبر 1971ء کو مسٹر بھٹو نے کہا تھا:۔

"یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر اس سال کے اندر اندر جمہوریت بحال نہیں کی جاتی تو پھر پاکستان کا بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ موجودہ حکومت اس بحران سے نہیں نمٹ سکتی۔ اے پاکستان کے عوام! ظلم اور غیر یقینی کی اس طویل رات کو ختم کرنے کے لئے میدان میں آ جاؤ۔ اب جرنیلوں کا دور ختم ہونا چاہئے تھا اور پاکستان کے عوام کو ہر قیمت پر اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے"

"چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ مسٹر بھٹو نے کہا تھا:۔

"ہمیں ناقابلِ معافی غلطیوں کی ایک تکلیف دہ وراثت ملی ہے۔ ہمیں پرانے پاپیوں کے گناہوں کی صفائی دینے کے لئے کہا جاتا ہے۔ سیاست کی ابجد سے بھی ناواقف سطحی ذہن تاریخ کا مزاج سمجھے بغیر بنیادی اہمیت کے سیاسی فیصلے کرتے رہے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج پاکستان تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے" (عظیم المیہ)

"یہ تھیں 71-1970ء کی تلخ حقیقتیں جن کی پیش گوئی میں نے کی تھی۔ عوام کے منتخب رہنما کے طور پر یہ میرا فرض تھا کہ پاکستان کے عوام کو آنے والی تباہی سے خبردار کروں۔

یحییٰ خان کی جفا نے میری بار بار کی تنبیہوں پر کوئی کان نہ دھرا اور بالآخر ہم تباہی سے دوچار ہوئے"۔

"آٹھ برس گزر چکے ہیں اور آج ایک بالکل مختلف صورتِ حال درپیش ہے۔ بحران 71-1970ء سے کہیں زیادہ سنگین اور گہرا ہے۔ 1970ء میں خطرہ مشرقی پاکستان کھونے کا تھا۔ 1978ء میں خطرہ بچے کھچے پاکستان سے بھی ہاتھ دھونے کا ہے۔ 1970ء میں منظر پر تین طاقتیں تھیں 1978ء میں صرف دو یعنی فوج اور پیپلز پارٹی 1970ء کے زخموں کے مرہم غائب ہو چکے ہیں عوام اور فوج کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ سوال واضح ہے پاکستان کی حاکمیت کس کا حق ہے؟ عوام کا یا فوج کا؟ ہمارے معاشرے کا نظم و نسق کون چلائے گا۔ پارلیمینٹ یا جرنیل؟ عوام کو خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟ حالات لازماً حتمی تصادم کی طرف لے جا رہے ہیں اور اس کا نتیجہ انتہائی خوفناک ہو گا"۔

"اسپین میں بھی ایسا ہی تضاد تھا۔ پچاس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے مگر اس دور کی تلخ یادیں آج بھی ہسپانوی عوام کے ذہنوں میں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تازہ ہیں۔ اسپین ان شدید زخموں کی وجہ سے آج بھی مفلوج ہے اسی طرح، مغربی معترضین کے پروپیگنڈہ کے برعکس اسپین میں اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے کے ذمہ دار فرڈیننڈ اور ازابیلا نہیں تھے بلکہ المیہ غرناطہ کا باعث دمشق کے مسلمان کا قرطبہ کے مسلمان سے حسد اور فریب کاری تھی۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا تو صرف چیف الیکشن کمشنر تھے جیسے مولوی اور اس کا جان۔ اسپین کی مثال میں ہمارے لئے دو سبق ہیں ایک فوج اور عوام میں خطرناک تصادم کا اور دوسرا ایک اسلامی ریاست کے خاتمے کا۔ ہسپانوی کہتے ہیں "توڈو پورلا پاتیا" پاکستانی کہتے ہیں "پاکستان زندہ باد" باسق اسپین کا بلوچستان ہے اور رندیسہ پاکستان کا سندھ"

"کیتھولک ازم کو اسپین کے تمام مسائل کا حل بتایا جاتا تھا۔ پاکستان کے پاس بھی تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ اگر اس بارے میں شبہ ہو تو میڈم رانی کے گرائیں افضل چیمہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے"۔

"مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اگر اسلام کو بھارت سے اکھاڑ پھینکا گیا تو وہ کہیں اور پھل پھول لے گا مگر ہندو مت اکھڑا تو کہیں نہ پھول سکے گا"۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مت کو بچانے کے لئے اسلام کو اکھاڑ پھینکو۔ کیا مہاتما کے ارشاد کو سچا ثابت کرنے کے لئے

کوششیں ہو رہی ہیں"۔

"حال ہی میں شیخ عبداللہ نے کشمیر کے متعدد قصبوں میں مسلمانوں کا خون بہایا ہے۔ جنرل کو جھوٹے غرور اور حماقتوں سے باز آ کر سوچنا چاہئے کہ متبادل تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں یا یہاں ایک اور غرناطہ بنے گا اور یا ایک اور کربلا ...... میں پاکستان کا واحد لیڈر ہوں جو اس تصادم کو روک سکتا ہے اور ایسی جدوجہد میں جان سے گزرنا ایک قابلِ فخر موت ہوگی۔ ملک کو حتمی تباہی سے بچانے کے لئے میں خوشی سے زندگی قربان کر دوں گا"

"میں ایک قوم کی تعمیر، عوام کی خدمت اور تباہی کو ختم کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ ایک گھٹیا، وحشی اور کمینہ خصلت فوجی جنتا کے ہاتھوں بے عزت ہونے کے لئے نہیں۔ قوموں کی زندگی میں "بیسٹیل" پر ہلہ بولنے کا لمحہ ایک نہ ایک دن آ ہی جاتا ہے۔ فرانس والوں نے فوج اور اقتدار کی اس قابلِ نفرت علامت پر 14 جولائی 1789ء میں حملہ کیا تھا۔ پاکستان کے عوام اگر 1978ء میں نہیں تو 1989ء میں سہی، اپنے "بیسٹیل" پر ہلہ ضرور بولیں گے۔ وہ دن آ کر رہے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں۔ واحد حل یہی ہے ملک آئین چاہتا ہے۔

قوم جمہوریت چاہتی ہے۔

عوام پارلیمنٹ چاہتے ہیں۔

محنت کش پاکستان پیپلز پارٹی چاہتے ہیں

کچھ سمجھے؟ عوام یہ سب چاہتے ہیں اب امام مہدی بننے کی کوشش چھوڑ دو اور دفع ہو جاؤ"

☆☆..................☆☆

جناب ذوالفقار علی بھٹو فوج کے خفیہ اداروں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حال ہی میں مجھے ایچ آر ہیلڈ مین کی کتاب "اقتدار کی منزلیں" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں بصد معذرت ایک بڑی طاقت کے ساتھ موازنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ چونکہ میں ایک یہی موازنہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، لہٰذا پہلے ہی سے معذرت کر لی ہے۔ ہیلڈ مین صدر رچرڈ نکسن کا رفیع رضا تھا۔ "اقتدار کی منزلیں" میں ہیلڈ مین اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ صدر نکسن کے زوال میں سی آئی اے کا کردار شبہے سے بالاتر نہیں ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ابتدائی مقصد صرف انہیں بے دست و پا کرنا ہو۔ کتاب کے صفحہ نمبر 27 پر ہیلڈ مین کہتا ہے "اس مرتبہ سی آئی اے تیار تھی در حقیقت بہت ہی تیار۔ وہ اس کھیل میں کئی مہینے آگے تھے اور آج

مجھے یقین ہے کہ نکسن جس جال میں پھنسے تھے وہ سی آئی اے ہی کا پھیلایا ہوا تھا"۔

"ذیل کے اقتباسات یہ ثابت کریں گے کہ۔ موازنہ بے سبب نہیں۔ مشابہت اس قدر ہے کہ میں ششدر رہ گیا تھا:۔

(1) "نکسن اپنے وزیروں کے استعفے کا مطالبہ کر رہے تھے تاکہ ان کی جگہ نسبتاً مضبوط افراد کو آگے لایا جا سکے۔ در حقیقت ان میں سے چار کی وہ از سرِ نو تقرری کا ارادہ رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ حکومت کے ڈھانچے میں بعض ڈرامائی بلکہ انقلابی تبدیلیاں لانے والے تھے"

(2) "اپنے پہلے دور میں نکسن نے اس انقلاب کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک تنظیم نو کا بل پیش کیا تھا۔ کانگرس نے بوکھلاہٹ اور جلد بازی سے اس بل کو مسترد کر دیا۔ وائٹ ہاؤس کے مٹھی بھر معاونین کے ہاتھ میں طاقت مرتکز ہونے کے خدشات سے کانگرس میں ہراس پھیل گیا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ نکسن نے غصے میں آ کر اعلان کیا کہ اگر وہ انتخابات دوبارہ جیت گئے تو وہ صدارتی حکم کے ذریعے تنظیم نو کر دیں گے۔ کانگرس جائے بھاڑ میں۔ وہ انتخابات جیت گئے اور انہوں نے اپنے اس اعلان پر عمل بھی کیا"

(3) "نکسن راضی ہو گئے ...... میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہم گھر کی صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ اب وقت ہے کہ نئی ٹیم کو موقع دیا جائے ......وقت؟ ...... میں کہوں گا کہ ہم نے پہلے ایسا نہیں کیا مگر اب ہمارے پاس عوام کی تازہ تائید موجود ہے اور ان سے ہمارا ایک وعدہ اس صفائی کے بارے میں بھی ہے، جو ہم نے 1968ء میں نہیں کی تھی"

جنوری 1973ء میں یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ میں نکسن کی تنظیم نو کے پس منظر کے عنوان سے کہا گیا۔

(4) "صدر جس طرح [illegible] رد و بدل کر رہے ہیں لوگ اسے انتظامی انقلاب کا نام دیتے ہیں۔ صدر کا مقصد حکومت کو اس طرح سے چلنے پر مجبور کرنا، جس طرح وہ خود چاہتے ہیں۔ اعلیٰ انتظامی عہدوں میں ان مسلسل تبدیلیوں سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ صدر [illegible] دوسرے دور میں نکسن نے امریکہ کی عظیم وفاقی انتظامیہ کو نکیل ڈال دی ہے۔ اس مقصد کے حصول کا ایک

ذریعہ وائٹ ہاؤس کے اہم ترین شعبوں کے نگران معاونین کے طور پر اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کا تقرر ہے"۔

"یہ مضمون یکم جنوری 1973ء میں شائع ہوا تھا۔ چند ہفتے بعد' "پوسٹ" اور "ٹائمز" کی واٹر گیٹ کے بارے میں نت نئی کہانیوں کے کئی ماہ بعد' گیلپ پول نے انکشاف کیا کہ نکسن کی مقبولیت (یا قبولیت) پرانے سب ریکارڈ توڑ چکی ہے:

"واٹر گیٹ کی نقب زنی اور اس سے متعلق وڈورڈ اور برنشائن کے انکشافات عوام میں ہلچل پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے اور اب نکسن جیسا صدر' جس سے ڈیموکریٹ اور افسر شاہی اتنے خوفزدہ تھے جتنا وہ اس صدی کے کسی صدر سے نہیں رہے تھے' حکومت پر آہنی گرفت رکھتے ہوئے اپنے اقتدار کے عروج پر پہنچ چکا تھا"

"اگر نکسن کا تنظیم نو کا خواب پورا ہو جاتا' اور وہ صدر رہتے تو کیا ہوتا؟ اس خیال سے واشنگٹن کانپ جاتا ہے نہ صرف وہ اپنے وائٹ ہاؤس کے آٹھ اعلیٰ افسروں کے ذریعے حکومت کی باگ ڈور پر پوری طرح حاوی ہو جاتا بلکہ سرکاری ایجنسی کی اہم پوزیشنوں میں اپنے "ایجنٹ" داخل کر دیتا۔ نکسن کے خوفزدہ مخالفین کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا اور تب اچانک جنوری 1973ء میں واٹر گیٹ پکے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں آن گرا"۔

"نکسن چاہے کتنا ہی بے دست و پا ہو جاتا وہ کبھی ہار نہ مانتا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے چکر میں پھنس کر حکومت پر ایسی گرفت نہ کر سکتا جو تاریخ میں بے مثال تھی"

"واشنگٹن میں طاقت کے چار بڑے ستون ہیں۔ اہمیت کے لحاظ سے ان کی ترتیب یہ ہے (1) پریس (2) بیورو کریسی (3) کانگرس (4) خفیہ ایجنسیاں .... جنوری 1973ء میں ان میں سے ہر ایک صدر کی زد میں تھا اور صدر بھی ایسا جو امریکی عوام میں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا۔ چنانچہ واٹر گیٹ کا سلسلہ شروع ہوتے ہی طاقت کے ان بلاکوں میں سے ہر ایک نے جوشِ انتقام سے بھرپور وار کیا 1973ء کے جنوری' فروری اور مارچ کے مہینوں میں یہ بلاک وائٹ ہاؤس پر حملہ آور ہو چکے تھے"

"میں خود کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر سے نہیں ملا رہا اور نہ ہی اپنے پسماندہ ملک کو ایک سپر پاور سے۔ میری یہ مجال! تاہم اگر واشنگٹن میں طاقت کے چار ستون ہیں تو اسلام آباد کے بھی چار ستون ہیں (1) فوج (2) افسر شاہی (3) سرمایہ دار (4) سیاست دان میں عوام میں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا جب میرے خلاف سازش شروع ہو

"برائے مہربانی اس پر کڑی نظر رکھیں ان کو متحد ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ یہ ایک اصولوں کی بات ہے ڈر یا خوف کی نہیں۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ انہیں الگ الگ رکھیں"۔

...... "مجھے بتایا گیا تھا کہ جب غلام مصطفیٰ کھر نے مسٹر رؤف طاہر کو پنجاب کھی بورڈ کا انچارج بنایا تھا تو اس نے بہت مال کمایا تھا۔ کیا اس کی تحقیقات نہیں ہو سکتی"۔

(ب) "جب وزیر اعظم کے چیف سیکیورٹی آفیسر نے 25 مئی 1976ء کو اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد کے لئے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں رپورٹ پیش کی تو مسٹر بھٹو نے حسب ذیل حکم جاری کیا:

"آپ انہیں متحد ہونے نہیں دے سکتے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے"۔

"دوسری طرف انٹر سروسز کے ڈائریکٹر جنرل غلام جیلانی جنہوں نے خود کو اور اپنی ملٹری انٹیلی جنس کو ساڑھے پانچ سال تک میرے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے استعمال کی اجازت دی اور انہوں نے وائٹ پیپر ہی کے صفحہ نمبر 66 کے مطابق حکومت کو پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا تھا "سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں جو مرتبے اور مقام میں جناب بھٹو کے پاسنگ بھی ہو۔ جناب بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی مقام اور شہرت رکھتے ہیں اور جنہیں بین الاقوامی سیاسیات کی پیچیدگیوں کا گہرا علم اور تجربہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے لئے عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت ہیں"۔

لیفٹیننٹ جنرل جیلانی 20 دسمبر 1971ء کو میرے صدر پاکستان بننے سے پہلے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل تھے وہ اس حساس عہدے پر 5 جولائی 1977ء تک فائز رہے۔ فوجی انقلاب کے چند ماہ بعد انہیں سیکرٹری دفاع کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور آج بھی وہ اس انتہائی اہم عہدے پر متمکن ہیں۔ اگر وہ زیر عتاب ہوتے یا ان کے ساتھی جرنیل انہیں میرا پرلے درجے کا خوشامدی سمجھتے ہوتے تو 5 جولائی 1977ء کے روز یا اس کے فوراً بعد اور بہت سوں کی طرح رخصت کئے جا چکے ہوتے۔ جنرل جیلانی کے سوا وفاقی سطح کے تمام انٹیلیجنس افسر فوجی انقلاب کی رات یا ایک ماہ کے اندر اندر گرفتار کر لئے گئے تھے اور غالباً میرے

گئی ...... ابتداء میں پی این اے کی تحریک عوام کے اُبھارنے میں ناکام رہی تھی۔ میرا ارادہ تنظیم نو اور اصلاح کے ایک عظیم پروگرام پر عملدر آمد کا تھا۔ مارچ 1977ء کے انتخابات میں عوام کی طرف سے ملنے والی تازہ تائید کے بل پر' اور ہیلڈ مین کی "خفیہ ایجنسیاں" اس سے باخبر تھیں"۔

"وائٹ پیپر میں پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں ریاست کی خفیہ ایجنسیوں کو حکومت کے سیاسی بازو کے طور پر استعمال کرنے پر مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے ہیں اور اپنی پارسائی کا اظہار کیا گیا ہے۔ صفحہ 195 پر اپنے اس غم و غصّے کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"پی پی پی حکومت کے سیاسی بازو کے طور پر ریاست کی خفیہ ایجنسیوں کا استعمال' خصوصاً عام انتخابات کے زمانہ میں' بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ جب انٹیلیجنس جیسے حساس اداروں میں سیاست گھس آئے تو پھر یہ ریاست کی اندرونی اور بیرونی سکیورٹی کا بنیادی کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتیں' جو ایک جمہوری معاشرے کا لازمی جزو ہوتی ہیں سیاسی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں اور ریاستی سکیورٹی کا کام مسخ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے"

"اس موقف کی حمایت میں صفحہ نمبر 197 میں فوجی ٹولے کے موجودہ وزیرِ قانون اے کے بروہی کی ان معروضات سے اقتباس دیا گیا ہے جو انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کی درخواست کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ میں پیش کی تھیں۔ بروہی صاحب فرماتے ہیں:۔

"اس تمام عرصے میں انٹیلی جنس بیورو مسٹر بھٹو کے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا"

"اس کے علاوہ اس درخواست سے ایک اقتباس اور بھی ہے' یہ صفحہ نمبر 181 پر ہے:۔

"مسٹر بھٹو نے ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو کو بھی ایسی ہی ہدایت جاری کی۔ مسٹر اے کے بروہی نے مسٹر زیڈ اے بھٹو کی نظربندی کے خلاف مقدمہ کی سماعت کے دوران فیڈریشن کی طرف سے دلائل دیتے ہوئے سپریم کورٹ میں کہا۔ (ا) جب ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو نے یکم اپریل 1976ء کو مسٹر بھٹو کو پیش کی جانے والی رپورٹ میں اپوزیشن پارٹیوں کے اشتراکِ عمل کے امکان کی نشان دہی کی تو مسٹر بھٹو نے درج ذیل حکم جاری کیا:۔

"برائے مہربانی اس پر کڑی نظر رکھیں ان کو متحد ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ یہ ایک اصولوں کی بات ہے ڈر یا خوف کی نہیں۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ انہیں الگ الگ رکھیں"۔

...... "مجھے بتایا گیا تھا کہ جب غلام مصطفیٰ کھر نے مسٹر رؤف طاہر کو پنجاب کھی بورڈ کا انچارج بنایا تھا تو اس نے بہت مال کمایا تھا۔ کیا اس کی تحقیقات نہیں ہو سکتی"

(ب) "جب وزیر اعظم کے چیف سیکیورٹی آفیسر نے 25 مئی 1976ء کو اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد کے لئے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں رپورٹ پیش کی تو مسٹر بھٹو نے حسب ذیل حکم جاری کیا ہے۔

"آپ انہیں متحد ہونے نہیں دے سکتے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

"دوسری طرف انٹر سروسز کے ڈائریکٹر جنرل غلام جیلانی جنہوں نے خود کو اور اپنی ملٹری انٹیلی جنس کو ساڑھے پانچ سال تک میرے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے استعمال کی اجازت دی اور انہوں نے وائٹ پیپر ہی کے صفحہ نمبر 66 کے مطابق حکومت کو پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں کہا تھا "سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں جو مرتبے اور مقام میں جناب بھٹو کے پاسنگ بھی ہو۔ جناب بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی مقام اور شہرت رکھتے ہیں اور جنہیں بین الاقوامی سیاسیات کی پیچیدگیوں کا گہرا علم اور تجربہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے لئے عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت ہیں"۔

لیفٹیننٹ جنرل جیلانی 20 دسمبر 1971ء کو میرے صدر پاکستان بننے سے پہلے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل تھے وہ اس حساس عہدے پر 5 جولائی 1977ء تک فائز رہے۔ فوجی انقلاب کے چند ماہ بعد انہیں سیکریٹری دفاع کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور آج بھی وہ اس انتہائی اہم عہدے پر متمکن ہیں۔ اگر وہ زیر عتاب ہوتے یا ان کے ساتھی جرنیل انہیں میرا پرلے درجے کا خوشامدی سمجھتے ہوتے تو 5 جولائی 1977ء کے روز یا اس کے فوراً بعد اور بہت سوں کی طرح رخصت کئے جا چکے ہوتے۔ جنرل جیلانی کے سوا وفاقی سطح کے تمام انٹیلیجنس افسر فوجی انقلاب کی رات یا ایک ماہ کے اندر اندر گرفتار کر لئے گئے تھے اور غالباً میرے

خصوصی معاون راؤ عبدالرشید' فیڈرل سکیورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود' انٹیلی جنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر شیخ اکرام' سب 5 ر جولائی ہی کو حراست میں لے لئے گئے تھے"۔

"میرے خیال میں چیف سیکورٹی آفیسر سعید احمد خان وسط جولائی اور اوائل اگست 1977ء کے درمیان گرفتار ہوئے اور سابق سیکرٹری داخلہ فضل حق فوری طور پر ملازمت سے برخاست کر دیئے گئے تھے۔ اس وقت کے سیکرٹری داخلہ ایم اے کے چودھری جو پاکستان کے اس وقت کے چیف جسٹس کے بھائی تھے اس "اعزاز" سے محروم رہے۔ انہیں یہ "اعزاز" اپنے بھائی کے ساتھ ہی ملا لیکن ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ یعنی لیفٹیننٹ جنرل جیلانی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا اس کے برعکس وہ جہاں تھے مزے سے وہیں رہے اور بعد میں سیکرٹری بنا کر وزارت دفاع میں پہنچا دیئے گئے۔ پانچ سال تک میرے انٹیلی جنس آفیسر ہونے کی حیثیت سے وہ میرے خیالات تک رسائی رکھتے تھے"

"وزیر اعظم پاکستان کے طور پر دوبارہ منتخب ہونے کے بعد جن نازک موضوعات پر میں نے ان سے گفتگو کی ان میں سے چند یہ تھے:

(1) وفاقی سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کی مکمل تنظیم نو

(2) سنٹرل انٹیلی جنس کا ایک مربوط انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ادغام جس کو دو درجوں میں تقسیم کیا جائے۔ (ا) داخلی (ب) خارجی

(3) اصلاحات

لیفٹیننٹ جنرل جیلانی سے میری مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں گرما گرم اور جاندار بحثیں ہوتی رہیں اگر فوجی ٹولہ میرے خفیہ ایجنسیوں کے ناجائز استعمال سے اتنا ہی ناراض ہے تو انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل' جنرل جیلانی کو اپنے ساتھی جرنیلوں کا نشانہ نمبر 1 ہونا چاہئے تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجھے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے مجھے قاتل اور جدید میکاولی قرار دیا ہے۔ معیشت کو تباہ کرنے کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ میری وجہ سے ملک خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ متعدد مسلم ممالک اور چین کا دورہ کرتے ہوئے وہ فائلیں اور دستاویزات ساتھ لے کر گئے تاکہ مجھے قاتل اور خطرناک انسان ثابت کر سکیں۔ اس کے برعکس انقلاب سے چند ماہ قبل لیفٹیننٹ جنرل جیلانی نے تحریر فرمایا تھا اور میں اقتباس کو پھر دہراتا ہوں

"اس وقت سیاست کے میدان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں جو مرتبے اور مقام

کے لحاظ سے جناب بھٹو کے پاسنگ بھی ہو۔ جناب بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی مقام اور شہرت رکھتے ہیں اور جنہیں بین الاقوامی سیاسیات اور پیچیدگیوں کا گہرا علم اور تجربہ ہے۔ انہوں نے پاکستان کے لئے عظیم الشان خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت ہیں"

"جب ملک کے بدقسمت شہریوں پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں۔ جئے بھٹو کہنے کی پاداش میں قید اور کوڑوں کی سخت سزائیں دی جا رہی ہوں جب عورتوں پر لاٹھیاں برسائی جا رہی ہوں آنسو گیس پھینکی جا رہی ہو میرے لئے درگاہوں پر دعا مانگنے کے جرم پر انہیں جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہو .... یہ بات عقل و فہم سے بعید ہے کہ ملٹری انٹیلیجنس کا سربراہ جو میری ناگزیر قیادت کے بارے میں ایسی خوشامدانہ رپورٹیں بھیجا کرتا تھا۔ فوجی ٹولے کے ڈھانچے میں اس قدر اہم عہدے پر کیسے فائز ہے؟ .... اس سوال کو لیفٹیننٹ جنرل جیلانی کی مجھے (تب کے) میجر جنرل ضیاء الحق کی چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کے لئے چھ جرنیلوں کی حق تلفی کر کے تقرری کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیابی کے ساتھ ملا کر دیکھا جانا چاہئے .... یہ کہانی کا صرف ایک حصہ ہے مگر اس معمولی سی نقاب کشائی کے ساتھ بھی میں یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کس نے کس کا استحصال کیا؟ کیا ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ اور اس کے چیف آف سٹاف نے میرا استحصال کیا یا میں نے ان کا؟"

"ایوب خاں اور یحیٰی خاں نے خفیہ ایجنسیوں کو کیسے استعمال کیا؟۔ یحیٰی خاں نے 1970ء کے انتخابات پر اثر انداز ہونے اور سیاست دانوں میں اختلافات کو ہوا دینے کے لئے خفیہ ایجنسیوں کو استعمال کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مجھے اس کا اچھی طرح علم ہے کیونکہ میں بھی ان کا نشانہ تھا۔ میری پارٹی پر خفیہ ایجنسیوں کا شدید دباؤ تھا 1970ء کے انتخابات کے بعد یحیٰی خاں کے مارشل لاء کے زوال تک سول اور ملٹری خفیہ ایجنسیاں منتخب نمائندوں پر قابو پانے کے لئے میری پارٹی میں گھسنے کی سرتوڑ کوشش کرتی رہیں"۔

"بنگلہ دیش کے مرحوم صدر شیخ مجیب الرحمٰن نے جنوری 1972ء میں لندن کے لئے روانہ ہوتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی خواہش ہے کہ مغربی پاکستان کے وہ صرف پانچ افراد پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں پلٹن میدان میں سرعام پھانسی پر لٹکا سکیں ان میں سے دو کا تعلق سول اور فوجی خفیہ اداروں سے تھا"۔

"مجیب الرحمٰن نے سیاست کے میدان میں ان لوگوں کی "کارگزاریوں" کی کافی

تفصیلات بتائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارا تجربہ بھی ان سے مختلف نہیں رہا"۔
"ایوب خاں نے بھی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں رہنے دی تھی اس نے جمہوری مجلسِ عمل کو سول اور ملٹری خفیہ اداروں کی مدد سے توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے انہی اداروں کے ذریعے چاہا کہ میری پارٹی کی بنیاد ہی نہ رکھی جا سکے۔ اس نے 30 ر نومبر اور یکم دسمبر 1967ء کو میرے تاسیسی اجلاس کو سبوتاژ کرنے اور انہی خفیہ اداروں کے ذریعے اپنے خلاف میری تحریک کو روکنے کی کوشش کی۔ ایوب خاں کے خفیہ اداروں کے "مثالی" استعمال کے تحت میں صرف تین واقعات پیش کرتا ہوں"۔

(1) جب 1965ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو ہماری ملٹری انٹیلی جنس کی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بھارتی بکتر بند ڈویژن کے محلِ وقوع کا پتہ چلانے میں ناکام رہے۔ ایوب خاں غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل کو راولپنڈی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ بریگیڈیئر ریاض حسین، جو بعد میں جنرل ریاض حسین بنے (اور یحیٰ خاں کی حکومت میں بلوچستان کے گورنر رہے) ان دنوں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ میں وزیر خارجہ کی حیثیت میں موجود تھا۔ ایوب خاں نے ریاض حسین کو سخت سُست کہا، اس نے کہا کہ ملٹری انٹیلی جنس ملک کے لئے شرمندگی کا باعث بنی ہے۔ میں نے بریگیڈیئر ریاض حسین سے کہا کہ بھارتی بکتر بند ڈویژن بھوسے کے ڈھیر میں گم کوئی سوئی تو نہیں جو مل نہ سکے۔ صدر ایوب خان نے زخم خوردہ لہجے میں کہا "وہ ایک دیو ہے، سوئی نہیں"۔ وہ بار بار بریگیڈیئر ریاض حسین سے وضاحت طلب کرتے رہے کہ خفیہ ایجنسیوں کو آخر کیا ہو گیا ہے اور بریگیڈیئر ریاض کانپتی زبان سے صرف یہ کہتے رہے "سر! جون 1964ء سے فوجی ایجنسیاں انتخابات اور انتخاب کے بعد کے حالات کے بارے میں سیاسی کام کرتی رہی ہیں"۔ چند روز بعد ہم نے بکتر بند ڈویژن کو خفیہ اداروں کی مدد سے نہیں بلکہ اتفاق سے دریافت کر لیا۔ ایک بھارتی قاصد جموں میں ایک مجاہد کی گولی کا نشانہ بن گیا اس سے برآمد ہونے والے کاغذات سے ہمیں مطلوبہ معلومات مل گئیں اور جان میں جان آئی"

(2) "ایوب خان کی خصوصی ہدایات کے تحت ایجنسیوں نے 1965ء میں صدارتی امیدوار کے طور پر جنرل اعظم خاں کا راستہ روکا تھا"۔

(3) "نومبر 1964ء کے آغاز میں میرے ایک بہت قریبی دوست اور مشرقی پاکستان کے ممتاز سیاستدان مجھ سے ملنے 70 کلفٹن کراچی میری رہائش گاہ آئے وہ متحدہ

تھمادیا تاکہ وہ اس تار کو جلا سکیں"۔

"یہ ایک خفیہ ایجنسی کا شاندار سیاسی کارنامہ تھا مگر یہ صدر کی ذات کے لئے اور اس کے انتخابی مفادات کے لئے تھا۔ میں بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں مگر میرا موقف واضح ہو چکا ہے۔ میرے زمانے کے خفیہ ادارے وہ کرتب نہیں دکھاتے تھے جو مارشل لاء کے آمروں کے دور میں دکھاتے رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ اب یہ ادارے کیا کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ منظر عام پر آجائے گا"۔

میرا اصل قاتل

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے موت کی کوٹھڑی سے اپنی آخری تحریر میں لکھا ہے :۔

"مجھے جس چیز نے حیران کیا اور جس کی مجھے توقع نہ تھی' وہ طاقتیں تھیں جو اپوزیشن کی پشت پر جمع ہو گئی تھیں۔ ان طاقتوں نے دسمبر 1976ء کے وسط سے جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ مجھے خفیہ ہاتھوں کے بارے میں اطلاعات جنوری 1977ء کے آغاز سے ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ رفیع رضا نے مجھ سے ساڑھے چار گھنٹے کی ملاقات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) تشکیل پا رہا ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کا صدر کون ہو گا اور دوسرے عہدیدار کون کون سے ہوں گے۔ اس نے مجھے اس منصوبے کے اسباب' اس کی حکمت عملی اور مقاصد کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اپنے تجزیئے کے آخر میں اس نے مجھے تین متبادل پیش کئے :۔

(ا) ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جاؤں

(ب) انتخابات کو ملتوی کر دوں یا

(ج) خطرناک نتائج کے لئے تیار ہو جاؤں۔

"اس کا اصرار تھا کہ میں ان معلومات کے ذریعے کو جاننے پر زور نہ دوں مگر یہ کہ ان تمام منصوبوں کے بارے میں وہ مصدقہ اطلاعات کی بنیاد پر بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے

رائے مانگی اس نے مشورہ دیا کہ میں ری پراسیسنگ پلانٹ کو بھول جاؤں اور یہ یقینی ہے کہ اپوزیشن اس کو انتخابی مسئلہ نہیں بنائے گی۔ صرف عوام کو بدھو بنانے کے لئے کبھی کبھار سرسری ساذکر کیا جائے گا' اس اُمید پر کہ عوام ری پراسیسنگ پلانٹ اور اینٹی پاور پلانٹ میں فرق نہیں جان سکیں گے۔ رفیع رضا نے مجھے خبردار کیا کہ میرے اردگرد جو لوگ جمع ہیں اور جو اس وقت مجھے اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے کے مشورے دے رہے ہیں اور بڑی جذباتی تقریریں کرتے ہیں وقت پڑنے پر جب پردہ گرے گا تو کہیں نظر نہ آئیں گے۔ ہم نے یہ گفتگو کھانے کی میز پر بھی جاری رکھی اس کے بعد میں نے اس قدر اہم معلومات اور مشورے دینے پر اس کا شکریہ ادا کیا تاہم میں نے اسے بتادیا کہ اب انتخابات ملتوی کرنے کا وقت نہیں رہا اور نہ ہی ری پراسیسنگ پلانٹ کا مسئلہ بھلایا جاسکتا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہم انتخابات منصفانہ طریقے سے جیتیں گے اور اگر نہ جیت سکے تو اپوزیشن کو آزادی ہوگی کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کے معاہدے کو منسوخ کردے' اس میں ترمیم کرے یا اسے کنویں میں ڈال دے۔ رفیع رضا نے کہا کہ اسے ہماری منصفانہ انتخابات میں کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہے مگر شاید ہم اس کامیابی کا مزانہ چکھ سکیں۔ چونکہ وہ مزید وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے جواب دیا "تو کیا ہوا؟ ہم یا الیکشن ہار جائیں گے یا کامیابی کا مزا نہیں چکھ سکیں گے"

"اپنی موٹے شیشوں کی مڑے ہوئے فریم والی عینک کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی مانگ اور بالوں کی پشت پر ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے کہا "مگر سر! میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ صرف انتخابات یا عہدے کا مسئلہ نہیں" ۔ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور تم میرا جواب سمجھ گئے ہو" .... رخصت ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہی ...... میں نے کہا "ضرور" اس نے پوچھا " آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ آخر آپ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس قدر مہیب خطرات کیوں مول لے رہے ہیں" ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہ سب اس لئے کر رہا ہوں تاکہ ایک منصفانہ معاشرے کی بنیاد رکھی جاسکے۔ میرا ملک مضبوط اور جدید بنے۔ میرے عوام جن کو مسرت کے لفظ کے معنی تک معلوم نہیں' ان کی زندگیوں میں خوشیاں بھر جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ شاید آنسو تو ہمیشہ بہائے جاتے رہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ کم سے کم' اور کم شدت سے بہیں" ۔

"میرے ڈاکٹر نصیر شیخ۔ وزیر پیداوار کے رخصت ہونے کے بعد ملاقات کے لئے

آئے۔ ڈاکٹر ایک باریک بین آدمی ہیں۔ انہوں نے کہا "وہ (رفیع رضا) نروس اور پریشان نظر آرہا تھا۔ سر! وہ کسی بھوت کی طرح سفید نظر آتا تھا"۔ نصیر شیخ نے مجھ سے پوچھا آیا میں نے اس سے کوئی سخت بات کر دی تھی۔ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی بات پر چونکا...... "نہیں"...... میں نے کہا "میں نے اس سے کوئی تلخ بات نہیں کہی۔ مگر جو موضوع زیر بحث تھا وہ بہت تلخ تھا"۔

"پی این اے کا قیام میرے لئے غیر متوقع نہ تھا۔ میں ماضی کی روایات کے پیش نظر اس کا منتظر تھا۔ رفیع رضا نے مجھے منصوبے کے بلیو پرنٹ سے اور اس کو اڑانے کے بارود دونوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ "جگتو فرنٹ" "سی او پی" اور "ڈیک" دیسی کارروائیاں تھیں۔ پی این اے کی صورت میں اتحاد دیسی نہیں بدیسی سازش کا نتیجہ تھا۔ اگر پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام کو متاثر یا تباہ کرنے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو اس کی اگر تمام تر نہیں تو بنیادی ذمہ داری پی این اے اور فوجی ٹولے پر عائد ہو گی۔ اسی لئے دونوں اداکار ملی بھگت سے کھیل کھیل رہے ہیں۔ غیر ملکی حکومتوں کی اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں صرف ہم پاکستان میں غیر ملکی حکومتوں کی پالیسیوں پر چلتے ہیں"۔

"تین سال کے مسلسل مذاکرات کے بعد مارچ 1976ء میں فرانس اور پاکستان کے درمیان ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ طے پایا۔ فرانس تحفظات کے مسئلہ پر بالکل مطمئن تھا۔ معاہدہ پاکستان کی طرف سے میری حکومت اور فرانس کی طرف سے صدر جسکارد کے مابین طے ہوا اور ویانا کمیشن نے اس کی توثیق کی۔ کمیشن میں شامل امریکی نمائندے نے توثیق کے حق میں رائے دی۔ اگر بین الاقوامی ایٹمی کمیشن تحفظات کے بارے میں مکمل طور پر مطمئن نہ ہوتا تو اس سلسلے میں مطلوبہ توثیق اور رضامندی کبھی نہ دیتا اگست 1976ء میں میں نے امریکہ کی متبادل تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اس وقت فرانسیسی حکومت نے بھی امریکی مداخلت پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ 5؍جولائی 1977ء تک فرانس نے بنیادی معاہدے کے بارے میں مضبوط موقف اپنائے رکھا

چودہ ماہ تک پاکستان کے عوام کو ترسانے اور مسلح افواج کو لٹکائے رکھنے کے بعد بالآخر جنرل ضیاء کو 23؍اگست 1978ء کو راولپنڈی کی پریس کانفرنس میں تسلیم کرنا پڑا کہ انہیں فرانس کے صدر کا ایک پیار سے بھرا شائستہ خط ملا ہے مگر اس سے بات نہیں بنتی۔ انہوں نے یہ منحوس خبر سنائی کہ فرانس مذاکرات کے ذریعے معاہدے میں تبدیلیاں چاہتا ہے۔ سو یہ ہے

اصل معاملہ! دراصل صدر فرانس نے انہیں منہ چھپانے کا موقع دیا ہے مگر پلانٹ کی پلوٹونیم جدا کرنے کی استعداد کا موقع نہیں دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کہانی ختم ...... فرانسیسی حکومت نے معاہدہ ایک سول اور آئینی حکومت سے کیا تھا' کسی فوجی آمریت سے نہیں۔ معاہدہ عالمی حیثیت کے مالک ایک منتخب وزیراعظم سے طے پایا تھا جسے تینوں فرانسیسی صدر ڈیگال' پومپیدو اور جسکارد ویستانگ کی نظروں میں وقعت حاصل تھی یہ کسی ایسے بے اعتبار بے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے نہیں ہوا تھا جو اپنے ہی عوام سے کئے ہوئے وعدے ڈھٹائی سے توڑ دیتا ہے"

"بھارتی وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی سے نئی دہلی میں ملاقات کے بعد بھیجے جانے والے صدر کارٹر کے سخت خط کے باوجود بھارت امریکہ ہی سے یورینیم حاصل کر رہا ہے۔ سخت خط کا مرار جی ڈیسائی کو کیا فرق پڑتا ہے جب تک اسے مزید دھماکے کرنے کے لئے یورینیم ملتا رہے۔ اس کے برعکس جنرل ضیاء صدر جسکارد کے شائستہ خط ہی پر پھولے نہیں سماتے۔ چاہے اس میں یہی کہا گیا ہو کہ پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم رکھنے کے لئے معاہدے پہ نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ فرانسیسی بڑی شائستہ قوم ہیں انہوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کو پھانسی چڑھانا دو سو سال قبل ترک کر دیا تھا یہ فطری امر تھا کہ جنرل ضیاء کو خوبصورت پلانٹ کی موت کی اطلاع دینے کے لئے فرانسیسی صدر نے فصیح فرانسیسی زبان سے نرم ترین الفاظ کا انتخاب کیا مگر نرم ترین خط بھی اس درد اور اذیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو اس اقدام سے پیدا ہوئی ہے مگر کمپلیکسوں کے مارے جنرل ضیاء نے خط کی شائستگی کا ذکر کر کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہی تھا۔ کیسی ذلت ہے ہم وطنو! زندگی بھر کے خواب کی کیسی اذیت ناک شکست و ریخت! "

☆.................☆

جناب بھٹو وائٹ پیپر میں اپنے خلاف عائد کئے گئے ایک الزام کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"انتخابات کے ضمن میں وائٹ پیپر میں بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں انتخابات کو اپوزیشن سے ایک طرح کی "جنگ" سمجھ رہا تھا۔ "مارو یا مر جاؤ" منصوبے کے عنوان (وائٹ پیپر کے صفحہ نمبر 11 پر کہا گیا ہے:

"اپنے انتقامی مزاج کے عین مطابق مسٹر بھٹو نے آئندہ انتخابات کو اپوزیشن کے خلاف "جنگ" سمجھ رکھا تھا ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ....

"مختصر یہ کہ یہ ایک جنگی منصوبہ ہو گا جس میں کسی بات کو اتفاقات پر نہیں چھوڑا جائے گا۔ ہمیں دشمن کے خلاف ایسی مہم شروع کرنا ہے جس میں ہم اپنے مضبوط

پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے کمزور پہلوؤں پر حملہ کریں"

"یہ جنگی اصطلاحیں مسٹر بھٹو کی تقریروں ان کے اور ان کے معتمد ساتھیوں کے تیار کیئے گئے منصوبوں میں بار بار نظر آتی ہیں"۔

"7 جنوری 1977ء کی قومی اسمبلی کی تقریر میں عام انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے میں نے کہا تھا .... "میں جانتا ہوں کہ سیاست دان انتخابات سے اسی قدر پہلوتہی کرنا چاہتے ہیں جس قدر جرنیل جنگ سے مگر فرق یہ ہے کہ سیاسی جنگیں (سیاسی انتخابات) ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق لڑی جاتی ہیں جبکہ (عام) جنگوں کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا"

"میری تقریر کا یہ حصہ وائٹ پیپر کے پیش لفظ کے صفحہ (III) پر نظر آتا ہے۔ کوئی جاہل ہی ان استعاروں سے لفظی مطلب اخذ کرے گا جب تک کہ مقصد ہی مجھے بدنام کرنا میرے خلاف تعصب اور نفرت کو ہوا دینا نہ ہو۔ "مارو یا مر جاؤ" "کوئی بات اتفاقات پر اٹھا نہ رکھو" محض عزم اور منصوبہ بندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صوبے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے فرمایا ہے کہ اناج کی پیداوار کے کام کو "جنگی خطوط" پر کیا جانا چاہیئے۔ کیا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ 5 جولائی 1977ء کو سیاسی کیریئر کے لئے اپنے فوجی پیشے کو خیرباد کہنے والے یہ جنرل صاحب جنگی جنون میں مبتلا ہیں۔ دن بھر ہی سیاسی رہنما تحریروں اور تقریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ سیاسی عمل کو تیز تر اور رواں کیا جاسکے۔ سیاست سب سے لطیف فن اور سب سے بڑھ کر تخلیقی پیشہ ہے"

"کوئی قابل ذکر سیاست دان ایسا نہیں جس کے جارحانہ الفاظ سے جرنیلوں کو کوئی خطرہ درپیش ہو۔ البتہ اس کا الٹ ایک حقیقت ہے کم از کم پاکستان میں ہمارے ہاں سول حکومت کے زمانے میں جرنیل، جمہوریت کے گن گاتے ہیں اور آئین سے وفاداری کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہ سیاسی حکومت کی عاجزانہ وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وقت آنے پر اس کا تختہ الٹ سکیں اور اقتدار پر قابض ہو سکیں"۔

"جہاں تک سرکاری ملازموں کو ہراساں کرنے کا تعلق ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کوئی خلاف ورزی نہیں کی گئی تھی میں صرف ایک مثال دیتا ہوں (وائٹ پیپر کے) صفحہ 87 اور 88 پر کراچی کے عظیم جلوس کا ذکر ہے۔ جلوس کی قیادت کرنے کے لئے میری کراچی آمد پر کراچی ایئرپورٹ پر عوام کا ایک سمندر اُمڈ آیا تھا۔ چیف آف آرمی سٹاف اپنی وردی کی وجہ سے ہجوم میں سے پہچانا جاسکتا تھا۔ ہجوم کی وجہ سے میں اس سے ہاتھ تو نہیں ملا سکا مگر اس نے اپنی

مخصوص مسکراہٹ (جواب کافی عام ہو چکی ہے) کے ساتھ گرم جوشی سے ہاتھ ہلا کر میرا استقبال کیا تھا۔ کیا وہ جلوس میں شامل تھا۔ اس بارے میں یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا جواب اس امر پر منحصر ہے کہ ڈنڈا کس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وائٹ پیپر کا سبق ہے"

"میری 1970ء کی انتخابی مہم بھی بالکل انہی اصولوں کے مطابق منظم کی گئی تھی المرتضیٰ کا مہمان خانہ کنٹرول روم تھا۔ ویسے ہی پلان چارٹ' بل اور تجزیئے تیار کئے گئے تھے۔ ویسے ہی دوروں کا منصوبہ بنایا گیا اور ان پر عمل کیا گیا انہی رفیع رضاؤں' پیرزادوں اور کھروں کو خصوصی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ چونکہ ہم نے انتخابات پوری تیاری سے لڑنے تھے اس لئے ہم نے یحییٰ خاں کی دھاندلی کا مقابلہ کیا اور اسے ناکام بنا دیا۔ چونکہ ہم انتخابی جنگ میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر کودے تھے ہمارے جنگی منصوبے تیار تھے۔ "مارو یا مر جاؤ" کا جذبہ موجود تھا اس لئے ہم بحرانوں' سازشوں اور سانگھڑ جیسے قاتلانہ حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے قابل تھے۔ ہم تمام رکاوٹوں کے باوجود 1970ء میں فتح مند ہوئے۔ اسی ناقابلِ تسخیر جذبے کے باعث 1977ء میں بھی ہم کامران ہوئے۔ 1970ء میں بھی میں نے اتفاقات پر انحصار نہیں کیا تھا۔ میں نے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا میں جاروب کشوں کی جھگیوں میں گیا۔ کچی آبادیوں کے جونپڑوں میں گیا۔ ہر جگہ میں نے قدموں کے نشان چھوڑے' میری آواز گھر گھر پہنچی"۔

"ایک گاؤں ایسا بھی تھا جس میں میں تین مرتبہ گیا چونکہ اس گاؤں میں ایک پیر کے وراثتی اثر ورسوخ کی وجہ سے میرے ذہن میں شبہ باقی تھا اس لئے میں وہاں چوتھی مرتبہ گیا تب گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا "سائیں! آپ ہمیں اس قدر شرمندہ کیوں کر رہے ہیں۔ ہم اور کس کو ووٹ دے سکتے ہیں؟"

"............اور میں نے دیکھا کہ صرف میری ہی آنکھوں میں آنسو نہ تھے یہ ایک گاؤں تھا جو صدیوں میں پہلی مرتبہ ایک گنہگار سیاست دان' نہیں' ایک سزائے موت کے مجرم کے لئے ایک پیر کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ جب میری جیپ روانہ ہو رہی تھی تو دور تک جئے بھٹو کے نعروں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ شاید میں اس سرزمین کے غریبوں کے دلوں کی ان گہرائیوں تک پہنچ گیا ہوں جس کا دوسرے ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اس گھر میں جس کی چھت بارش میں ٹپکتی ہے میں اس کا ایک فرد بن چکا ہوں۔ میرا تعلق اس زمین کے پسینے سے اس کے دکھوں سے ہے۔ میرا اس کے عوام سے ایسا گہرا ابدی رشتہ ہے جسے کوئی فوج کبھی نہیں توڑ سکتی"

جناب بھٹو آگے چل کر لکھتے ہیں:" آخر فوجی ٹولہ پی این اے کے داغ دھونے کے لئے اس قدر بے قرار کیوں ہے! میں نے جرنیلوں پر تو غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے کا الزام نہیں لگایا تھا؟ الزام میں نے پی این اے پر لگایا تھا اور صفائی حکومت پیش کر رہی ہے۔ پی این اے کی "معصومیت" کو اس طرح ثابت کیا جاتا ہے جیسے اپنی "معصومیت" ثابت کی جا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ فوجی ٹولے کو خدشہ ہے کہ اس کے داغ بھی دھلیں گے جب پی این اے کے داغ دھل جائیں۔ اسی لئے انہیں پی این اے پر بیرونی امداد حاصل کرنے کے الزام میں کوئی بنیاد نظر نہیں آئی اور نہ کسی اور قسم کی مداخلت کی شہادت ملتی ہے تاہم میں پھر یہ دہراتا ہوں کہ تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود میں اس دور کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ ظاہر ہے یہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر میں اس سنسنی خیز ریکارڈ میں کوئی چونکا دینے والا اضافہ کر سکوں"۔

"جب اگست 1977ء میں میں راولپنڈی آیا تو میں نے عزیز احمد سے دفتر خارجہ کی بیرونی مداخلت کے موضوع پر تیار کردہ پچاس صفحات پر مشتمل دستاویز کی نقل مانگی تھی اس نے کہا کہ اس دستاویز کی جو کاپی اس کے پاس تھی وہ اس نے سیکرٹری جنرل انچیف غلام اسحٰق کو دے دی تھی۔ وائٹ پیپر میں اسی لئے بیرونی مداخلت کی شہادت نہ ملنے پر ناقابل فہم اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ باقی واقعات چھوڑ بھی دیں تو صرف آپریشن پہیہ جام ہی بیرونی مداخلت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ 1958ء میں مارشل لاء کے وقت غیر ملکی رہنمائی میں آپریشن پہیہ جام پر عمل کیا گیا تھا یہ فوج کا "ٹاپ سیکرٹ" تھا۔ چراٹ میں اس کے لئے ٹریننگ دی گئی تھی آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کا پہیہ جام کر دیا جائے اور جب کراچی میں بھی پہیہ جام ہوا اور میں نے چیف آف آرمی سٹاف کو بتایا کہ مجھے فوج کے گذشتہ آپریشن پہیہ جام کے بارے میں معلوم ہے تو اس کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے کہا کہ اس کوڈ کا استعمال ایک ناخوشگوار اتفاق ہے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اس نے ہکلاتے ہوئے پی این اے میں شامل چند ریٹائرڈ فوجی افسروں کا حوالہ دیتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی"

"اگرچہ میری 28 اپریل 1977ء کی تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے کہ میں نے "واویلا نہیں کیا" مگر اس کے باوجود وائٹ پیپر میں بیرونی مداخلت کی حرف بحرف روئداد بیان نہ کرنے پر طعنہ زنی کی گئی ہے تاہم جائز حدود کے اندر رہ کر میں نے ساری بات کہہ دی ہے۔ میں سرکاری دستاویزات کو تاش کے پتے یا ان سے بھی بدتر نہیں سمجھتا۔ مجھ پر احتیاط اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا لازم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ واقعات کے بہاؤ اور پی این اے اور فوجی ٹولے کے

اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے سارا بھانڈا پھوٹ رہا ہے جیسے پی این اے کے سارے سیاست دانوں کو پوری کہانی نہیں بتائی گئی تھی اسی طرح سارے جرنیلوں کو بھی سازش کی تفصیلات اور گہرائی کے بارے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ اس ایک طویل سال کے دوران چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے ہر منفی شہادت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ فنڈز صرف ایک سیاست دان کو پہنچائے گئے تھے اور وہ جماعت اسلامی کا میاں طفیل محمد تھا۔ اب اس نے اس خزانے کو کیسے لٹایا اور کس کو لٹایا یہ اس کے اور پی این اے کے دوسرے گروہوں کی آپس کی بات ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میاں طفیل محمد نے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو مشورہ دیا تھا کہ تمام نامناسب شہادتوں کو تلف کر دیا جائے۔ 23 جولائی 1977ء کو مجھے مری میں اطلاع ملی کہ 19 جولائی کو اس موضوع سے متعلق دستاویزات کا انبار جلا دیا گیا ہے اور میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وائٹ پیپر کی اشاعت تک کے 385 دنوں میں ایسی کئی آتش بازیاں ہوئی ہوں گی۔ اس تسلی کے بعد کہ اس موضوع سے متعلق ہر ثبوت کو تلف کیا جا چکا ہے۔ وائٹ پیپر میں مجھے چیلنج کیا جاتا ہے کہ میں اپنی پھانسی کی کوٹھڑی سے میاں طفیل محمد کی اس گھناؤنے منصوبے میں شرکت کی حرف بحرف روئیداد پیش کر دوں"

"میں پھر کہوں گا کہ یہ سب ڈرامہ ہو رہا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے اور سب ایک منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔ فریق ثانی نے مقاصد پورے کرنے کے لئے ایک سال کی مہلت دی تھی اور اب وہ پہلو بچا رہا ہے۔ یہ لوگ مذور لنگ کے ذریعے مہلت میں توسیع کی اپیل کر رہے ہیں مگر صورت یہ ہے کہ چابک اور کوڑے کی ننگی آمریت میں بھی عوام کو خوفزدہ اور زیر نہیں کر سکے۔ ان کا خیال ہے کہ پی این اے کے ساتھ کھلم کھلا اشتراک شاید موعودہ تبدیلی کا موقع فراہم کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ریاستوں کے مفادات کا تحفظ خالی خولی بیان بازی سے تو نہیں کیا جاتا اس کے لئے لفاظی کی نہیں قربانیوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور قربانیاں عوام تبھی دیا کرتے ہیں جب انہیں ابھارا جائے مگر انہیں کوئی غیر نمائندہ ٹولہ ابھار نہیں سکتا وہ صرف ان لیڈروں کے پیچھے چلتے ہیں جن پر وہ بھروسہ کرتے ہوں۔ باقی سب ڈھکوسلہ ہے۔ عہدِ قدیم سے بین الریاستی ڈپلومیسی کا اصول رہا ہے کہ دباؤ کا جواب دباؤ ہے۔ عوام کے جوابی دباؤ کے بغیر یہ جنگ ہاری ہوئی ہے اور عوام کو کوڑے مار مار کر انہیں ایسے سورمائی کارنامے انجام دینے کے قابل ہی کب چھوڑا گیا ہے؟ اب چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور پی این اے کے لیڈروں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے کہ امداد بند ہونے سے خود انحصاری بڑھے گی اور یہ تو ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

منافقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مسئلہ اقتصادی امداد کا نہیں ری پراسیسنگ پلانٹ کا ہے اگر ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کو ترک کیا گیا یا اس میں ترمیم کی گئی (جو بظاہر ہو چکا ہے) تو اس کے جو نتائج ہوں گے ان کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں"۔

"قوم کو بعض تاریخ ساز فیصلوں کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ چیف آف آرمی سٹاف پہلے ہی عوام سے کئے گئی مقدس وعدے توڑ چکا ہے اب وقت ہے کہ ایک وعدہ وہ کسی غیر ملکی طاقت سے بھی توڑے اور اپنے لئے نہیں بلکہ پاکستان کی خاطر اپنے وعدے سے مکر جائے۔ مغرب کی نماز سے پہلے یا بعد میں اسے ٹیلی ویژن کے ذریعے بیرونی دباؤ کے مسئلہ پر قوم کو اعتماد میں لینا چاہئے۔ قومی اتحاد کی اپیل کرنا چاہئے اور بیرونی دباؤ کی مزاحمت کی علامت اور پہلے قدم کے طور پر سینٹو سے الگ ہونے کا اعلان کرنا چاہئے مگر یہ سب بغیر گھٹیا اداکاری کے کرنا چاہئے اب عوام ڈراموں سے تنگ آ چکے ہیں"۔

☆.........................☆

جناب ذوالفقار علی بھٹو آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے وائٹ پیپر میں پی این اے کے فنڈز کے بارے میں چار اہم حوالے موجود ہیں۔ صفحہ 237، 238 اور 239 پر ان کا ذکر ہے۔ میں اس کا پورا اقتباس نقل کرتا ہوں :۔

"پی این اے نے الیکشن کیسے لڑا اور اس کے لئے مطلوبہ فنڈز کیسے جمع کئے؟ یہ اس وائٹ پیپر کا موضوع نہیں ہے کیونکہ یہ دستاویز عام انتخابات کے انعقاد کے موضوع تک محدود ہے اور یہ ذمہ داری حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن کی تھی۔ البتہ مسٹر بھٹو نے پی این اے کے فنڈز کے ذرائع کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کو ریکارڈ پر لایا جائے۔ 28 اپریل 1977ء کو قومی اسمبلی اور پارلیمینٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا : ...... "کیا یہ کوئی راز ہے کہ گذشتہ چند ماہ سے پاکستان میں غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ اس قدر کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کراچی میں ڈالر کا ریٹ سات بلکہ چھ روپے تک گر گیا ہے۔ یہ رقم لوگوں کو مختلف خدمات کے معاوضے کے لئے استعمال کی جا رہی ہے۔ جیل جانے کے لئے، اذانیں دینے کے لئے۔ ڈاکیوں، گوالوں اور میٹر ریڈروں کو پیپلز پارٹی دشمن لٹریچر کی تقسیم کے لئے .... ڈالروں کی بوریوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں۔ میری پارٹی کے

ارکان یہ سب باتیں میرے نوٹس میں لاتے رہے ہیں۔ مگر میں نے اس پر واویلا نہیں کیا.........."

"ڈالروں کی یلغار کا ایک اور حوالہ اس وقت کے وزیر اطلاعات طاہر محمد خاں کی ذرائع ابلاغ کے سربراہوں سے روزانہ ملاقاتوں کی روئداد میں ملتا ہے۔ 27 اپریل 1977ء کی روئداد میں پیپلز پارٹی کو ایک ہدایت نامہ کا حوالہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کوئٹہ اور پشاور میں ڈالروں کے سستے ریٹ کی خبر کو پھیلایا جائے۔ غالباً اس کا مقصد مسٹر بھٹو کی الزام تراشی کے لئے راہ ہموار کرنا تھا۔ انہوں نے الزام تو لگایا مگر کراچی کی مارکیٹ کا حوالہ دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ تاہم 28 مارچ 1977ء کو نومنتخب قومی اسمبلی کی حلف برداری کی تقریر میں مسٹر بھٹو کا رویہ ذرا مختلف تھا۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا:۔

"اگر ضرورت پیش آئی اور مجھے اشتعال دلایا گیا تو میں حرف بہ حرف یہ روئداد بیان کردوں گا کہ کس طرح اپنی خفیہ میٹنگوں میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ وسائل، رقوم اور طاقت کا منبع سمندر پار ہے۔ کیا اپوزیشن والوں کا یہ غیر ذمہ دارانہ دعویٰ مناسب تھا کہ فتح ان کی ہے کیونکہ ان کے وسائل سرحد پار سے آ رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپوزیشن کے دعووں پر یقین نہیں کروں گا کیونکہ یہ ناپختہ، غیر ذمہ دارانہ اور بچگانہ ہیں اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمارے دنیا کے تمام ملکوں سے نہایت اچھے تعلقات ہیں۔ پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے تقریروں میں بار بار یہ الزام دہرایا گیا کہ پی این اے کو غیر ملکی امداد مل رہی ہے۔ یہ بھی اشارہ کیا گیا کہ خلیج کی مارکیٹ سے پاکستانی کرنسی غائب ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو شاید اس کا پی این اے کی حرکتوں کے ساتھ ساتھ آغا حسن عابدی کے دوروں سے بھی تعلق ہو، جن کے بیگ نوٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔ جہاں تک مسٹر بھٹو کا تعلق ہے، انہوں نے پی این اے پر الزام ثابت کرنے کے لئے "حرف بہ حرف روئداد کبھی بیان نہ کی۔ اقتدار کے دنوں میں یا اس کے بعد انہوں نے کوئی دوسری شہادت پیش نہیں کی۔ اگرچہ ان کے وکیل سپریم کورٹ کے سامنے اصل خطوط پیش کر رہے ہیں۔ پی این اے کی مبینہ غیر ملکی امداد کے بارے میں کوئی دستاویز پیش نہیں کی گئی۔ وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ سے ملنے والے کاغذات میں بھی پی این اے کی خفیہ امداد کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں ملا۔ راؤ رشید نے سابق وزیر اعظم کو 12 اپریل کو ایک

رپورٹ بھیجی تھی جس میں لکھا تھا...... "لاہور میں پی این اے کو بھاری رقوم فراہم کرنے والوں میں منّو شہزادہ بنسیم سہگل، فضل دین اینڈ سنز اور شیخ سالم علی شامل ہیں"۔

"یہ سب پی این اے کی شرمناک اور کھلم کھلا پردہ پوشی ہی تو ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر حکومت پی این اے کا اس جوش و خروش سے دفاع کیوں کر رہی ہے؟ جیسے دونوں یک جان دو قالب ہوں۔ جولائی 1977ء کی افتتاحی تقریر کے بعد سے سکھر بیراج کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا ہے اور "آپریشن فیئر پلے" کے بارے میں سوال کرنا بے معنی ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فروری 1977ء سے پی این اے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس سازش میں شریک رہے ہیں۔ ایجی ٹیشن ایک ملی بھگت تھی۔ شہری لباس یا ملاؤں کا روپ دھارے فوجی جوان پی این اے کے مظاہروں میں بھیجے جاتے تھے تاکہ ہجوم بڑھے اور عوام کو ابھارا جا سکے"۔

"اس دوران لاہور میں چوتھی کور کے تین بریگیڈیروں کی عظیم الشان حکم عدولی بھی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق تھی۔ اس حکم عدولی کے موقع پر بھی بریگیڈیروں کا کورٹ مارشل نہیں کیا گیا۔ انہیں ملازمت سے برطرف تک نہیں کیا گیا۔ بس راولپنڈی ٹرانسفر کر دیا گیا اور شاباش دیتے ہوئے ہدایت کر دی گئی کہ ذرا اِدھر اُدھر ہو جائیں اور اب تک انہیں یقیناً ترقیاں دے کر یا دوسرے طریقوں سے نوازا جا چکا ہو گا۔ جونیئر افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ وزیر خارجہ عزیز احمد پر کراچی کے خطاب کے دوران سوالات کی بوچھاڑ کر دیں۔ جنرل اقبال کے استعفیٰ کی کہانی بھی ایک فریب تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنی 5 جولائی 1977ء کی تقریر میں خود تسلیم کیا تھا کہ تین شہروں میں مارشل لاء ایک لنگڑا مارشل لاء تھا۔ اسی طرح سانحہ کا ڈرامہ بھی چیف آف آرمی سٹاف کی شراکت کے ساتھ رچایا گیا تھا"۔

"پی این اے نے مذاکرات کو نئے سرے سے شروع کرنے کا اقدام چیف آف آرمی سٹاف کے حکم پر کیا تھا۔ وائٹ پیپر تو پی این اے کی پردہ پوشی کرنا ہی ہے۔ پی این اے کا دفاع خود موجودہ حکمرانوں کا دفاع ہے۔ آخر ان کے کون سے مفادات مشترک تھے اور باقاعدہ نکاح کی نوبت کیونکر پہنچی؟ دراصل چیف آف آرمی سٹاف عرصے سے مودودی اور جماعت اسلامی کے معتقد اور پیروکار تھے۔ وہ امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے رشتہ دار اور جالندھری بھائی ہیں۔ دونوں کی سوچ انتہائی رجعت پسندانہ ہے۔ اگرچہ ان کی مشترکہ عادات سے سب واقف ہیں مگر ایک خود غرض اور موقع پرست مخلص محض اسی قدر مشترکہ مفاد کی بناء پر ایسی دوہری

سازش نہیں کرے گا۔ وہ چیف آف سٹاف کے اہم عہدے پر فائز تھا۔ اسے پے در پے ترقیاں دی گئی تھیں اور میری حکومت کا نا شکر گزار ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس دوہری سازش میں شریک ہونے (ایک پی این اے کے ساتھ اور دوسرے میری حکومت میں) کے لئے محض میاں طفیل محمد سے رشتے داری اور مودودی سے عقیدت مندی کافی نہ تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خفیہ ہاتھ ان سب مختلف راہوں کے مسافروں کو ایک ہی کشتی میں لا بٹھاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وائٹ پیپر غیر ملکی مداخلت کے الزام کی تردید کے لئے اتنا تردد کرتا ہے اور پی این اے کے دفاع کے لئے مارا ماری کرتا ہے"

"اگر چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اس گھٹیا کاروبار میں اس طرح ملوث نہ ہوتا تو وہ پی این اے کے غیر ملکی تعلقات کے سلسلے میں ایک شریک جرم والی پریشانی کا اظہار نہ کرتا۔ وائٹ پیپر میں پی این اے کے خلاف الزامات کی پوری شدت سے تردید کی گئی ہے اور اس کی "معصومیت" کو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا ہے"

جس کا کام اُسی کو ساجے

جناب ذوالفقار علی بھٹو وائٹ پیپر میں عائد کئے گئے الزامات کے جواب میں لکھتے ہیں: ۔

" مجھ پر قومی خزانے کے ضیاع کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مارشل لاء کی یہ کم خرچ بالانشیں قسم کی حکومت کیا کرتی پھر رہی ہے۔ عوام کی طرف سے کوئی نمائندہ ذمہ داریوں کے بغیر اس حکومت نے اپنے پہلے پچھیسے سال میں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے سیکرٹریٹ کے لئے جو بجٹ تیار کیا ہے اس کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں :۔

(I) چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے سیکرٹریٹ کے ملازموں کے لئے =/6'32'500 روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ میرے زمانے میں یہ رقم =/5'67'500 روپے تھی۔

(II) کنٹریکٹ الاؤنس کے لئے =/8'90'000 روپے طلب کئے گئے ہیں۔ ایک سال پہلے اس مد میں =/8'25'000 روپے مانگے گئے تھے۔

(III) میرے زمانے میں دوروں کے لئے چار لاکھ کی رقم رکھی گئی تھی۔ موجودہ بجٹ میں بھی وہی رقم موجود ہے۔ حالانکہ اس حکومت کی کوئی نمائندہ حیثیت یا سیاسی ذمہ داری نہیں ہے۔

(IV) سٹاف کی تنخواہوں کے لئے =/6'13'300 روپے مانگے گئے ہیں۔ میرے "شاہ خرچیوں کے دَور" میں یہ رقم =/3'65'000 روپے تھی

اور ایک سال کے غیر جمہوری دور میں اس مد سے =/5'96'500 روپے سے زائد خرچ بھی ہو چکا ہے۔

(V) سٹاف الاونس کے طور پر میرے زمانے میں تین لاکھ نوے ہزار روپے کی رقم رکھی گئی تھی جو اس سال بڑھ کر چھ لاکھ اٹھانوے ہزار تین سو روپے ہو گئی ہے۔

(VI) اس سال مارشل لاء سیکرٹریٹ سے منسلک حفاظتی یونٹ پر 83 ہزار روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

(VII) خفیہ سروس کا بجٹ دس لاکھ روپے اس حفاظتی یونٹ کے علاوہ ہے۔

(VIII) میرے جیسے "پکاڈلی کے شہزادے" نے گذشتہ سال اپنے دورِ حکومت میں =/89'16'000 روپے "ضائع" کیے تھے مگر اس سال چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکرٹریٹ پر =/1'06'48'000 روپے خرچ کئے جا رہے ہیں اور اس رقم میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور اس کے معاونوں کی تنخواہیں اور الاونس شامل نہیں ہیں۔

(IX) میرے "بُرے زمانے" میں انٹیلیجنس بیورو =/3'56'78'000 روپے کھاجاتا تھا مگر آج کے "اچھے دنوں" میں اس کی خوراک 3'85'64'000 روپے ہیں"۔

"آج کل جبکہ چاندی سرداروں کی حیثیت اور مرتبے تک کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ میں اس دعوے کی جسارت نہیں کروں گا کہ 1958ء میں وفاقی وزیر بننے سے قبل میں کوئی مفلس شخص نہیں تھا۔ ادائیگیوں کے توازن میں مستقل خساروں کے باعث وزارتِ تجارت کا قلمدان ہمیشہ بڑا پُرکشش رہا ہے اور میں تو صدر ایوب کے "سنہری دَور" میں وفاقی وزیر تجارت رہا تھا۔ یہ وزارت بس سونے کی کان تھی۔ اگر ایوب خاں کے بیٹے راتوں رات لکھ پتی بن سکتے تھے' تو میرا دوسرا بیٹا بھی مارشل لاء کے بعد ہی پیدا ہوا تھا یہ "لٹیرے شرفاء" کا زمانہ تھا۔ جب وزیر بیک وقت اسلام آباد میں وزیر خزانہ اور امریکہ میں عالمی بنک کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ اسی پہلے مارشل لاء کے زمانے میں منظم اور وسیع پیمانے کی بدعنوانیوں کا آغاز ہوا تھا۔ "سنہری دَور" دراصل سرکاری سالوں کا دَور تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا کردار ان آلائشوں سے پاک تھا۔ میں حکومت کے ان چند رہنماؤں میں سے تھا جن کا دامن صاف تھا۔ مارشل لاء لگے چند ماہ گزرے تھے۔ کراچی کی ایک تقریب میں ایک گستاخ

صنعتکار نے مذاق مذاق میں فقرہ کسا کہ مارشل لاء بلیک مارکیٹنگ کو کیا روکے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ بھی بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ اس کا جواب تھا "جناب! سچ بات تو ہے کہ کرتا ہوں ...... ورنہ میرا کاروبار ٹھپ ہو کر نہ رہ جائے؟" میں نے وہیں اور اسی وقت اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس خبر کو پاکستان میں دبا دیا گیا مگر یہ نیویارک ٹائمز میں چھپی۔ تاہم صنعتکار کو ایک گھنٹے کے اندر اندر رہا کر دیا گیا کیونکہ ایک معمولی نوجوان وزیر تجارت کے جوش و خروش سے تجارتی برادری کے خوفزدہ اور نجی سرمایہ کاری کی فضا خراب ہونے کا خدشہ تھا"۔

"بعد میں، جب میں ایندھن، بجلی اور قدرتی وسائل کا وزیر بنا تو یہ ایک اور سونے کی کان تھی۔ میں نے اس حیثیت میں پاکستان میں مغربی تیل کمپنیوں کی گلا گھونٹنے والی گرفت توڑی۔ میں نے پاکستان سے تیل کی صنعت کے دو غیر ملکی نمائندوں کے اخراج کے احکامات جاری کئے کیونکہ وہ نفرت انگیز بدعنوانیوں اور اقتصادی وزارتوں کے اعلیٰ افسروں کو رشوت دینے کی وارداتوں میں ملوث تھے۔ میں نے دسمبر 1960ء اور مارچ 1961ء میں سوویت یونین سے تیل کا معاہدہ کیا۔ اس کے بعد میں صنعت کا وزیر بنا تو یہ (وزارت) سنہری دروازوں والی سنہری کان تھی۔ انتہائی تن دہی کے ساتھ میں پبلک سیکٹر کی طرف متوجہ ہوا اور پی آئی ڈی سی کی ترقی پر دھیان دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد 22 خاندانوں اور ان کے سرپرست وزیر خزانہ نے مجھے بڑی کوشش سے اس وزارت سے ہٹوایا کیونکہ بدعنوانیوں کے خلاف میری تحقیقات کی ضرب ان پر پڑنے لگی تھی"۔

"تو یہ افسانوی دو تین کروڑ روپیہ ان پیشکشوں کے مقابلے میں کیا ہے جن کو میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے اکتوبر 1963ء اور دسمبر 1965ء کے درمیان حقارت سے ٹھکرا تا رہا تھا۔ میں کوئی پی این اے کا لیڈر نہ تھا کہ اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کا سودا کر لیتا۔ 1965ء کے موسم گرما میں جب میں اور میری بیوی پیرس میں تھے تو ہمیں ایک دعوت میں مدعو کیا گیا۔ ایک بہت اہم اور امیر ہمسایہ مسلم ملک کی شہزادی بھی مدعو تھیں۔ انہوں نے مجھے دعوت کے بعد اپنی رہائش گاہ پر آنے کو کہا۔ ہم ان کی شاندار رہائش گاہ پہنچے اور ان سے پاکستان اور علاقے کی سیاست پر گرما گرم بحث کرتے رہے۔ بعد میں کھانے کے دوران اور کار میں بھی گفتگو جاری رہی۔ شہزادی نے ہیرے کا ہار پہنا ہوا تھا۔ ہیرے کی شکل چٹان کے ٹکڑے جیسی تھی۔ کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں کافی کے لئے گئے۔ میری بیوی اور میں ایک کونے میں شہزادی

اور ان کی دو میزبانوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ انہوں نے گفتگو جاری رکھی۔ جو بڑی جاندار ہو گئی تھی۔ شہزادی سوچ میں ڈوبی لگ رہی تھیں۔ وہ خیالوں میں گم اپنے ہار سے کھیل رہی تھیں۔ پھر اچانک کہنے لگیں۔ "دیکھو ذوالفقار! اگر تم پاکستان کے صدر بن گئے تو میں تمہیں یہ ہار تحفے میں دے دوں گی" اور انہوں نے اپنی انگلیاں ہیرے پر رکھ دیں"

ہم سب خوب ہنسے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ سالہا سال بعد جب میں صدر پاکستان کی حیثیت سے ان کے عظیم ملک میں گیا تو شہزادی نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے محل میں دعوت دی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ دیر بعد شہزادی ایک پیکٹ لائیں اور مجھے کھولنے کو کہا۔ میں نے پیکٹ کھولا تو اندر سے وہی ہیرے کا ہار نکلا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے لئے اسے قبول کرنا ناممکن ہے۔ مگر ان کا اصرار تھا کہ "ہم اپنے وعدے نہیں توڑا کرتے" ۔ بمشکل تمام بات شہزادی کی سمجھ میں آئی اور مجھے ان کی منت کرنا پڑی کہ وہ یہ بیش قیمت ہار اپنے پاس رکھیں۔ تاہم میں نے انہیں بتایا کہ ان کا جذبہ تحفے سے بڑا تحفہ تھا اور ہیرے سے کہیں زیادہ بیش قیمت" ۔

"1970ء کے انتخابات کے دوران جب میں لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو ایک غیر ملکی مجھ سے ملنے آیا۔ تعارف اور دوسری رسمی باتوں کے بعد اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ملک کے صدر کی جانب سے انتخابات میں امداد کی پیشکش لے کر آیا ہے۔ معلوم ہے میرا ردِ عمل کیا تھا؟ پورے چار روز بعد لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل میں وکلاء کے ایک استقبالیہ میں میں نے اس صدر کو مڈل ایسٹ کا لاجمر پلان قبول کرنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس تقریر کے کوئی ہفتہ بھر بعد اس ملک کا سفیر مجھ سے میری کراچی کی رہائش گاہ پر ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے صدر نے میری تقریر پڑھی ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔ میں نے سفیر سے کہا کہ اپنے صدر سے بصد احترام یہ عرض کر دیں کہ انہوں نے بھی "میرا دل توڑ دیا تھا" ...... ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ تازہ ترین مثال اکتوبر 1976ء میں سعودی عرب کے شاہ خالد کے دورۂ پاکستان کی ہے انہوں نے مجھے ایک رولز رائس کار کا تحفہ دیا اور اصرار کیا کہ یہ ذاتی تحفہ ہے۔ ایک شخص سے دوسرے شخص کو۔ میں نے اس فراخدلانہ تحفے پر شاہ کا بے حد شکریہ ادا کیا مگر کار کو بلا تاخیر سرکاری ملکیت کے طور پر رجسٹر کر لیا گیا۔ اگر غلام محمد، شاہ ابن سعود سے تحفے میں ملی کیڈلک ہضم کر سکتا تھا تو میں بھی رولز رائس رکھ سکتا تھا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں مگر اتنا گنہگار بھی نہیں جتنا فوجی ٹولہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے اس قسم کی مثالیں دینے کا شوق نہیں مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ حکومت اپنا توازن کھو بیٹھی ہے اور مجھے اپنی صفائی میں کچھ

نہ کچھ مثالیں تو جانی ہیں۔ ان تمام سالوں میں میں اپنی عزت کی حفاظت کرتا رہا ہوں۔ مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں۔ میں ان کا اعتراف بڑے بڑے عام جلسوں میں بھی کرتا رہا ہوں۔ مجھ میں ہزار خامیاں ہو سکتی ہیں مگر میں بد عنوان نہیں۔ میرا نام اور میری شہرت عوام اور تاریخ کے سینے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے"۔

☆..........................☆

جناب بھٹو اپنی آخری تحریر میں پاک افغان تعلقات کے موضوع پر لکھتے ہیں "افغانستان کے بارے میں کبھی نرم کبھی گرم پالیسی نہیں چلے گی۔ تین سو برس پرانے مسئلے کے پیچیدہ جال کو شالیمار باغ میں صدر داؤد کا ہاتھ اٹھا کر یا افغان سفارت خانے کی تقاریب میں شرکت کر کے صاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ کی ضرورت ہے۔ آئندہ حالات دو اہم واقعات سے منسلک ہیں۔ ایک حیدر آباد ٹریبونل کو غیر مشروط اور یکطرفہ طور پر توڑنے کا فیصلہ اور دوسرا انقلاب افغانستان۔ (ہماری) حکومت افغانستان کی نئی حکومت کا اعتماد نہیں حاصل کر سکی اور صورت حال کو ناگزیر تباہی سے بچانے کے لئے اسے میری حکومت کے کارناموں کا سہارا لینا پڑا ہے"۔

"شدید مسائل اور کھچاؤ کے تھکا دینے والے سلسلے کے بعد جون 1976ء کے پہلے ہفتے میں سابق صدر افغانستان، سردار داؤد محمد خاں نے مجھے کابل کا دورہ کرنے اور افغانوں کے بقول "پاکستان اور افغانستان کے درمیان واحد سیاسی اختلاف" کو بات چیت کے ذریعے طے کرنے کی دعوت دی۔ کابل کی تفصیلی بحث کا ماحصل یہ تھا کہ وہ افغان ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنے سے قبل نیپ کے ان رہنماؤں کی رہائی چاہتے تھے جن پر حیدر آباد میں اسپیشل ٹریبونل میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے اصرار کیا کہ دونوں اقدامات بیک وقت ایک مجموعی سمجھوتے کی شکل میں کئے جائیں گو مذاکرات نتیجہ خیز نہیں رہے تھے مگر یہ طے پایا تھا کہ سابق صدر افغانستان مذاکرات جاری رکھنے کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے۔ تاہم میرے دورۂ کابل کے خاتمے پر نیوٹرلنگ (غیر جانبداری) کے پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں کی بنیاد پر ایک تاریخی مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ جب صدر داؤد اور ان کا وفد اگست 76ء میں پاکستان پہنچا تو کابل مذاکرات کے معاملات کو راولپنڈی کی گفت و شنید میں آگے بڑھایا گیا۔ ہر دور کے بعد پاکستان اور افغانستان کے وفود کو ان کے رہنماؤں کی طرف سے بیک وقت مجموعی سمجھوتے کا فارمولا تیار کرنے کی

ہدایت کی گئی۔ راولپنڈی سے دونوں رہنما اور وفود لاہور گئے۔ جب صدر داؤد کا شالیمار باغ میں گرم جوشی سے استقبال کیا جا رہا تھا" دونوں وفد ایک تحریری فارمولا تلاش کرنے کے لئے رت جگا کر رہے تھے۔ بالآخر فارمولا تلاش کر لیا گیا۔ اس میں افغانستان کی طرف سے ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر تسلیم کرنے اور اسی وقت پاکستان کی طرف سے نیپ کے رہنماؤں کی رہائی اور عام معافی کے اعلان کے لئے کہا گیا تھا۔ اس وقت کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ مسٹر عزیز احمد اس تحریری فارمولے کو لاہور گورنمنٹ ہاؤس میں میری حتمی توثیق کے لئے لائے۔ میں نے فارمولے کا مطالعہ کیا اور کہا "میں مطمئن ہوں"۔ صدر داؤد بھی مطمئن تھے۔ معاہدے پر دستخطوں کے لئے کابل میں رسمی تقریب ہونے والی تھی مگر بعد کے واقعات نے دورۂ کابل کو ناممکن بنا دیا"۔

"صدر داؤد مارچ 1978ء کے شروع میں دوبارہ پاکستان آئے مگر اس مرتبہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد تھے۔ یہ پاکستان اس پاکستان سے مختلف تھا جس کا انہوں نے اگست 1976ء میں دورہ کیا تھا۔ پنڈولم ان کے حق میں گھوم چکا تھا۔ میرا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر ہتھکنڈے کا سہارا لینے کی کوشش اور ولی خاں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش میں، فوجی حکومت ولی خاں وغیرہ کو مساوی جوابی اقدامات کے بغیر ہی رہا کر چکی تھی۔ "سیاسی اختلاف" وہیں کا وہیں تھا۔ اس نئی صورت حال نے بلوچ اور پختون رہنماؤں سے نہ مٹنے والے اختلافات اپنے حق میں استعمال کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فوجی حکومت نے مجوزہ معاہدے کو لاحاصل مقاصد پر قربان کر دیا ہے۔ یہ سوچنا ہی حماقت ہے کہ نیپ فوجی ٹولے سے تعاون کرے گی۔ اس کا مطلب ان جہاندیدہ لیڈروں کی سیاسی موت ہو گا"۔

"جنرل ضیاء الحق نے صدر داؤد سے دو ملاقاتیں کیں۔ ایک کابل میں اور دوسری پاکستان میں۔ صدر داؤد کا تختہ اُلٹے جانے سے قبل معاہدے کے خاکے کو باقاعدہ معاہدے کی شکل دینے کے مواقع گنوا دینے کے بعد اب فوجی حکومت افغانستان کے انقلاب سے بوکھلا اٹھی ہے۔ افغانستان کی ہلچل بھونڈے ردِ عمل کے بعد اب ازالے کی کوششیں کر رہی ہے۔ نئی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے غیر ضروری طور پر تاخیر کی گئی۔ انتہائی غیر دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغان انقلاب پر حملوں اور پی این اے میں اپنے کاسہ لیسوں کے دشمنانہ بیانات کو مقبوضہ پریس میں نمایاں جگہ دلوائی گئی"۔

"اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے حکومت اپنی فوجی بغاوت اور انقلاب افغانستان میں تمیز کرنے میں ناکام رہی۔ اگرچہ اس انقلاب کی قیادت مسلح افواج ہی نے کی تھی مگر نئی حکومت کی باگ ڈور سویلین پارٹی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاست کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ موجودہ افغان حکومت حکومت پاکستان کی کمزوریوں اور حماقتوں سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ فریب خوردگی کا پرندہ اُڑ چکا ہے۔ فوجی حکومت ایک دن دھمکیاں دیتی ہے دوسرے دن خوشامد پر اتر آتی ہے اور بغیر کسی بنیاد کے عمارت تعمیر کرنے والوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے"

☆..........................☆

جناب بھٹو پاک بھارت تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں "میں پوچھنا چاہوں گا کہ برطانوی وزیر اعظم کو دیئے گئے استقبالیہ میں بھارت کو "پیارا اور بڑا ہمسایہ" کہنے کی کیا تُک تھی؟ یا پھر یہ کہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں جنرل ضیاء نے "کچھ لو، کچھ دو" کا مصلحت آمیز جملہ کیوں دہرانا شروع کر رکھا ہے۔ بھارتی تسلط کا مقابلہ سلال ڈیم اور راجستھان نہر کے ذریعے کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ راجستھان نہر ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ ایک زرعی منصوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی فوجی مورچہ بندی ہے جو پاکستان کی مورچہ بندیوں کو (بشمول بی آر بی کینال) بالکل معمولی بنا دیتی ہے۔ راجستھان نہر جدید میگنیٹ لائن ہے۔ چار سال تک میری حکومت ایرانی حکومت کو اس مقصد کے لئے بھارت کو قرضہ دینے سے رُوکے رہی۔ اگر موجودہ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لیتی تو وہ بھی ایسا کر سکتی تھی"

"بھارت اور پاکستان کو درپیش اہم ترین مسئلہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں شملہ میں اہم اقدامات کئے گئے تھے اسی لئے میکاویلیائی مقاصد کے تحت کشمیر پر "خفیہ شق" کی موجودگی کی گپ مقبوضہ پریس اور وزارت اطلاعات کے تنخواہ دار صحافیوں نے بڑے مزے سے اڑائی۔ حکومت کو معلوم ہے کہ ایسی کسی شق کا وجود نہیں۔ اس کے باوجود اس جھوٹ کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی گئی"

"مقصد صاف ہے۔ میرے کندھوں پر بندوق رکھ کر اطاعت پسندی کی راہ اختیار کرنا۔ اگر 1973ء کے معاہدۂ شملہ میں کشمیر پر خفیہ شق ہوتی تو بہت پہلے اس کا افشا کر دیا جاتا۔ اندرا گاندھی انتخابی مہم کے دوران اس کا انکشاف کر دیتی۔ جنتا حکومت اقتدار سنبھالنے کے بعد اسے جاری کر دیتی۔ اگر ایسی خفیہ دفعہ تھی تو 5 جولائی 1977ء کی فوجی

بغاوت کے بعد فوجی حکومت نے اس کا اعلان کیوں نہ کیا۔ اس وقت تو شاندار داستانوں کا انبار لگا دیا گیا تھا۔ تب یہ کہانی کیسے بچی رہی تھی کہ جب فروری 1978ء میں بھارتی وزیر خارجہ مسٹر باجپائی پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے بھی ایسے کوئی انکشافات نہ کیے۔ گول مول بیان دینے کی بجائے وہ خفیہ معاہدے کا متن پیش کر دیتے اور زور شور سے اعلان فرما دیتے۔ معاف کیجئے ' حضرات ' بھارت اور پاکستان دونوں گذشتہ حکومتوں کے اس خفیہ معاہدے کے پابند ہیں جو میں آپ کے اور دنیا کے تسلیم کرنے کے لئے پیش کر رہا ہوں "۔

"مسٹر باجپائی نے ایسی کوئی بات نہیں کی اس کے برعکس انہوں نے اس شملہ معاہدے پر ہی زور دیا اس شکل میں وہ جون 1973ء میں منظور ہوا اور جیسا کہ آج تک برقرار ہے نہ کم نہ زیادہ۔ اس گپ کی تشہیر کے دو مقاصد تھے اول یہ کہ اس نام نہاد خفیہ مفاہمت کے مطابق تنازعہ کشمیر اب اقوام متحدہ میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ دوم یہ کہ شملہ معاہدے میں جنگ بندی لائن کو کنٹرول لائن تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حالانکہ شملہ معاہدے میں ایسی کوئی بات نہیں جو پاکستان کو اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ اٹھانے سے روک سکے۔ کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے گذشتہ تیس سال سے ہے اور ابھی تک حل طلب ہے پیپلز پارٹی کی حکومت یہ چاہتی تھی کہ دوبارہ اقوام متحدہ میں جانے سے پہلے باہمی مفاہمت کی ہر ممکن کوشش آزمائی جائے۔ یہ پیپلز پارٹی کے دو طرفگی کے اصولوں کے نظریئے کے مطابق تھا۔ کشمیر کا مسئلہ اب اقوام متحدہ کے ایجنڈہ پر ہے۔ یہی حقیقت کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے مسئلہ کشمیر مسلسل اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر رکھا 'اطاعت پسندی کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے کافی ہے۔ آج بھی اقوام متحدہ متنازعہ لائن کی نگرانی کر رہی ہے۔ گو فنڈز کی کمی درپیش ہے۔ اگر شملہ معاہدہ میں اقوام متحدہ کو کشمیر کے مسئلے میں دخل دینے سے روکنے پر سمجھوتہ ہوا ہوتا تو اقوام متحدہ کی فوج وہاں سے ہٹ چکی ہوتی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دور میں بھارتی حکومت کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اقوام متحدہ سے اپنی فوج متنازعہ لائن سے ہٹانے کی درخواست کرے "۔

"1976ء کے موسم سرما میں ڈنمارک کے وزیر دفاع نے کشمیر کے دونوں طرف متعین ڈینش دستوں کا دورہ کیا۔ تاہم حال ہی میں بھارتی وزارتِ داخلہ (غور فرمایئے وزارتِ خارجہ نہیں) کے ایک ترجمان نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب جنرل ضیاء بھارت کا دورہ کریں گے تو اقوام متحدہ کے مبصروں کی واپسی کا مطالبہ بہتر ہوتے ہوئے تعلقات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ جہاں تک جنگ بندی اور کنٹرول لائنوں کے فرق کا تعلق ہے دونوں کا مطلب ایک ہے۔ جنگ

بندی لائن ایک کنٹرول لائن ہے جبکہ کنٹرول لائن ایک طرح کی جنگ بندی لائن ہی ہے یہ آپس میں تبدیل ہونے والی اصطلاحیں ہیں"۔

"اعتراض یہ نہیں کہ جنگ بندی سے کنٹرول لائن کیوں بنایا جا رہا ہے کیونکہ گذشتہ پچیس برس سے جنگ بندی لائن کی اصطلاح اس قدر کثرت اور اصرار سے استعمال کی گئی ہے کہ اپنا مفہوم کھو بیٹھی ہے اس کی جگہ کنٹرول لائن کا نام استعمال کرنے سے لائن کا متنازعہ کردار نمایاں ہو گیا ہے اور اس میں جان پڑ گئی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ پاکستان کے مقبوضہ پریس کے ذریعے بھارتیوں کی رہنمائی کی جا رہی ہے کہ وہ ان اصطلاحوں کی جو دراصل پاکستان کے مفاد میں تھیں اپنے فائدے کے لئے تعبیر کریں۔ یہ قوم کے بنیادی مفادات سے انحراف نہیں تو اور کیا ہے؟"

"17 / اگست 1978ء کو لیبیا کے نائب صدر کو رخصت کرنے کے بعد اخباری نمائندوں سے راولپنڈی ایئرپورٹ پر غیر رسمی بات چیت کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے لیبیا کے نائب صدر کے اس جملے کی بہت تعریف کی کہ دونوں ملکوں کے اچھے تعلقات شخصیات کی وجہ سے نہیں ہیں۔ اگلے ہی سانس میں جب ان کی توجہ شاہراہ قراقرم پر بھارتی وزیر خارجہ کے اعتراض کی طرف دلائی گئی تو جنرل نے بین المملکتی امور میں شخصی معاملات کو دخیل کر دیا اور کہا کہ وہ مسٹر باجپائی کی دل سے قدر کرتے ہیں اور اس موقع پر کوئی مزید تبصرہ نہیں کریں گے۔ جن سنگھ کے اس انتہا پسند رہنما کے لئے یہ دلی قدر کہیں گذشتہ فروری میں تو نہیں پیدا ہوئی تھی جب اسلام آباد میں ان کی دو روزہ ملاقات ہوئی تھی"

"یہ بات کوئی راز نہیں کہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی (بھارتی وزیر خارجہ) کو بھارت کے مسلمانوں سے ازلی کا بیر ہے۔ وہ ان کے دشمن نمبر 1 رہے ہیں۔ ان کی جماعت کے فرقہ پرستانہ مقاصد جن کو مسٹر باجپائی بار بار دہرا چکے ہیں برصغیر پر ہندو تسلط اور راج قائم کرنا ہیں ان کا عوامی کیریئر شدید مسلم دشمنی سے عبارت ہے"

"چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اپنی مرضی کے آپ مالک ہیں مگر اگر لیبیا کے نائب صدر کے فقرے پر وہ اتنے خوش ہوتے ہیں تو پھر شاہراہ قراقرم جیسے اہم مسئلہ پر ذاتی تعلقات کے دخل در معقولات کی کوئی تک نہ تھی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو بلا پس و پیش موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اعلان کرنا چاہئے تھا کہ بھارت کو اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب شاہراہ قراقرم جیسے عظیم قومی مفاد کا سوال ہو تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھارت کی کھلی

اور توہین آمیز مداخلتِ بے جا کا جواب یہ کہہ کر گول کر جاتے ہیں کہ وہ باجپائی کے لئے دلی جذبات کے اظہار کے علاوہ کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ مگر جب میرے قتل کی روک تھام کی بات آتی ہے تو وہ مبینہ غیر ملکی مداخلت پر سیخ پا ہو جاتے ہیں"۔

☆.............................☆

جناب ذوالفقار علی بھٹو اپنے خلاف عائد کئے گئے "خانہ جنگی کرانے" کے الزام کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "میری حکومت نے خانہ جنگی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ یوں بھی، جیسا میں نے بیگم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست کے دوران حلفیہ بیان میں کہا تھا، خانہ جنگی کے اپنے تاریخی اسباب اور اجزاء ہوتے ہیں۔ یہ کسی حکومت کے سیٹی بجادینے پر شروع نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے عوامی ضمیر کا ایک مطلوبہ سطح تک پہنچنا اور مسلح افواج کا ظالموں اور مظلوموں کے حامی گروہوں میں بٹ جانا ضروری ہوا کرتا ہے۔ جب فوجی ٹولہ مسلح افواج کو مجموعی طور پر مخصوص مفادات کی حفاظتی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا ہو، تو خانہ جنگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں خانہ جنگی کے معروضی حالات پیدا کرنے کی بجائے حکومت محدود پیمانے پر تشدد اور خون خرابے کا بندوبست کر سکتی ہے۔ مگر ایسا تو اپوزیشن بھی کر سکتی ہے، بلکہ 1977ء میں کر بھی چکی ہے جب خانہ جنگی کے لئے حالات تیار ہوتے ہیں تو پھر فوجی انقلاب اسے نہیں روک سکتے۔ اصل میں فوجی انقلاب خانہ جنگی کے حالات پیدا کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج پاکستان خانہ جنگی کے جس قدر قریب ہے، اتنا 1977ء کے موسم بہار کے بدترین دنوں میں بھی نہیں تھا۔ سپریم کورٹ کی درخواست میں میرے ایک خصوصی معاون کے بیانات پر مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر چیف آف آرمی سٹاف نے فوری، بروقت اور راست کارروائی نہ کی ہوتی تو ملک خانہ جنگی کی آگ میں جل رہا ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ میری اپیل کی سماعت کے دوران اسی خصوصی معاون نے ایک حلفیہ بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اسے میرے خلاف استعمال کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا"۔

9 اگست 1977ء کو ایک جنرل نے جس نے بغاوت کو عملی جامہ پہنا کر چیف آف آرمی سٹاف کے منہ میں اقتدار کا لالی پاپ دیا تھا" "خانہ جنگی کے اس مبلغ" سے لندن میں تین گھنٹے تک ملاقات کی"۔

"گذشتہ چودہ ماہ میں چین کی طرح پاکستان میں بھی شدید اور نہ حل ہونے والے تضادات خوفناک حد تک بڑھتے جا رہے ہیں۔ پاکستانی ٹولے کو جنوبی بحیرۂ روم کے حالیہ واقعات کو بھی یاد

رکھنا چاہئے ...... یونان اقتصادی اور سماجی طور پر پاکستان سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کی فی کس آمدنی 1200 ڈالر سالانہ ہے' جبکہ پاکستان میں یہ صرف 1840 روپے ہے۔ یونان کو مغربی تہذیب کی ماں کہا جاتا ہے اور اس کے عوام کے سیاسی شعور کی سطح ہمارے ہاں سے کہیں بلند ہے۔ اس کے باوجود یونان کی سیاسی صورت حال ابتر ہے۔ فوجی کرنل جنہوں نے 1967ء میں حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا' یہی کہا تھا کہ وہ تضادات کو حل کرنے اور سیاسی استحکام کے لئے یہ قدم اٹھا رہے ہیں مگر سات سال بعد یونان میں حالات پہلے سے بھی ابتر ہیں اور انہوں نے نہ صرف اپنے ملک کا حشر خراب کر دیا ہے بلکہ ساتھ ہی قبرص کا بھی۔ ابھی ترکی سے جنگ چھڑتے چھڑتے بچی ہے۔ بالآخر یونانی قوم کو اپنے سیاسی رہنما کونسٹنٹائن کرامانیلس کو آواز دینا پڑی جو یونان کو تباہی سے بچانے کے لئے پیرس سے وطن پہنچا"۔

"ارجنٹائن نہیں تقسیم کا مسئلہ سلجھانے کی بجائے سالوں تک سیاست سے فٹ بال کھیلنے کے بعد فوجی ٹولے کے رکن جنرل ہار گنڈ یگے کو تسلیم کرنا پڑا کہ "چند سویلین معاونوں والے فوجی ٹولے سے کام نہیں چل سکتا"۔ جنرل ہار گنڈ یگے نے عوامی سویلین شراکت والی کھلی حکومت کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے یہ الفاظ بیونس آئرس میں ادا کئے گئے ہیں' مگر اسلام آباد میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے"

"تہذیب کا ایک اور مرکز اٹلی بھی ان دنوں گہرے اور شدید اقتصادی اور سیاسی بحران میں گرفتار ہے وہاں تو اخبارات زیادہ ہی شدید ہیں۔ مروّجہ نظام سے مایوس ہو کر اور موجودہ بحران کا کوئی نارمل علاج نہ پا کر ریڈ بریگیڈ والے اطالوی ریاست کے موجودہ ڈھانچے کو تباہ کر کے ایک نیا غیر طبقاتی ڈھانچہ بنانا چاہتے ہیں ان کا تجزیہ یہ ہے کہ موجودہ ڈھانچے کو تباہ کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ فوج کو اقتدار سنبھالنے پر مجبور کر دیا جائے۔ باقی کام فوج خود کر لے گی ان کے خیال میں جب فوج اقتدار پر قابض ہو جائے گی تو آئین اور اس کے تحت بنائے گئے اداروں پر مشتمل اطالوی نظام برباد ہو جائے گا اور جب ریاست کے ستون گرنے لگیں گے تو استحصالی ریاست کی عمارت بھی زمین بوس ہو جائے گی۔ ریڈ بریگیڈ والے حکومت پر فوج کے قبضہ کو مسائل کا حل سمجھتے ہیں جیسا حل پاکستان میں ہو رہا ہے مگر اٹلی کے بڑے فوجی اس دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ وہ انتہائی تعلیم یافتہ اور اطالوی قوم پرستی کی تاریخ سے باخبر ہیں۔ انہیں یاد ہے کہ اطالوی قوم کو حتمی اور فیصلہ کن فوجی کامیابی کے ذریعے متحد کرنے کے بعد جیریبالڈی

نے اپنی بیوی اینا کے ساتھ پہاڑوں کا رُخ کیا تھا اور نئی اطالوی قوم کے اتحاد کو مستحکم کرنے کا کام کاؤنٹ کامیلوڈی کیور' پیڈ مونٹ جیسے ماہر سیاست دان پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر سو سال قبل اٹلی کا استحکام ایک سیاسی ذمہ داری تھی تو آج (1978ء) میں اٹلی کی مسلح افواج فوجی مداخلت کے ذریعے اطالوی ریاست کا تیاپانچہ کرنے کی ریڈ بریگیڈ کی دعوت قبول نہیں کریں گی"۔

"انقلاب روس کے بعد لینن نے فوج پر پارٹی کی سیاسی بالادستی کو مستحکم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی تھی۔ اسٹالن بھی اس بنیادی ضرورت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لینن اور اسٹالن دونوں کو علم تھا کہ اگر فوج پارٹی پر یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے سیاسی کنٹرول اور نظم و نسق پر غالب رہی تو سوویت ریاست مستقل خطرے میں رہے گی۔ انقلاب کے دن سے لے کر آج تک سیاسی بالادستی یعنی پارٹی کو فوج پر بالادستی کا اصول سوویت ریاست کا مستقل اور بنیادی اصول رہا ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ اس کا مطلب ترقی اور مضبوطی ہے جب کہ دوسرا راستہ تصادم اور افراتفری کا راستہ ہے۔ 1957ء میں سوویت یونین کے وزیر دفاع فاتح برلن اور دوسری جنگ عظیم کے عظیم جرنیل مارشل زوخوف کو محض بوناپارٹسٹ (فوج پسند) رجحانات کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا تھا"۔

"عوامی جمہوریہ چین میں بھی انقلاب کے بعد سے یہی اصول رہا ہے اور اسی میں چین اور اس کے عوام کے لئے بہتری ہے۔ اگر چین میں فوج' پارٹی اور سیاسی قیادت پر غالب آ جاتی تو چین جنگی سرداروں کے دور کی طرف لوٹ جاتا۔ آخر چین کے اسّی کروڑ عوام کو مارشل لاء ضابطہ نمبر 12 نے تو متحد نہیں رکھا ہوا۔ ان کی ترقی اور طاقت کا راز سرعام کوڑوں کی سزاؤں میں تو نہیں ہے؟ چین اور چین کے عوام اپنی سیاسی قیادت اور سیاسی جذبے کی بدولت ان بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ یہی سیاسی جذبہ چین کے اتحاد اور اس کے اسّی کروڑ عوام کی قربانیوں کا محرک ہے۔ جب چین کے وزیر دفاع مارشل لن پیاؤ نے چیئرمین کو قتل کرنے اور چین پر فوجی تسلط جمانے کے لئے اپنا "اپریشن فیئر پلے" یعنی "پراجیکٹ 57" کا خاکہ تیار کیا تھا' تو وزیراعظم چواین لائی نے براہ راست فوج کی کمانڈ سنبھال لی اور مارشل لن پیاؤ کی سازش کو ناکام بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ وزیراعظم چواین لائی کی بروقت کارروائی' سیاسی قیادت اور پارٹی کی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے تھی اور اس نے چین کو تباہی سے بچا لیا۔

"ہمارے جرنیل ترکی کی بہت مثال دیتے ہیں۔ ترکی کی تاریخ سے کوئی واقفیت رکھے بغیر قسطنطنیہ کی فتح کے زمانے سے (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) ترکی کی مسلح افواج نے کبھی شکست کا

مزا نہیں چکھا۔ ترکی کی مسلح افواج اور اس کے فوجی رہنماؤں نے برطانوی سلطنت کے ظہور تک دُنیا کی عظیم ترین سلطنت قائم کئے رکھی۔ سلجوقیوں کے دور سے عثمانیوں کے زمانے تک، یہ صدیوں کی فوجی فتوحات کی شاندار داستان ہے۔ ان پے در پے فتوحات کے ساتھ ساتھ بعض ناکامیاں بھی ہیں۔ مگر کوئی ناکامی ایسی نہیں جو مسلح افواج یا اس کے رہنماؤں کے لئے باعثِ شرم ہو۔ حالانکہ بعض جنگوں میں ساری کی ساری فوج ختم ہو گئی۔ ایک بھی فوجی نہ بچا۔ ویانا میں جنرل مصطفیٰ کو شکست کوئی فوجی شکست نہ تھی۔ اسی طرح گیلی پولی کی جنگ میں ترک فوجیں اس بے جگری سے لڑی تھیں کہ جنگ کا نتیجہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ڈارڈ نیلسن کے مقام پر برطانویوں کی مکمل شکست ایسی تھی کہ ونسٹن چرچل مرتے دم تک اسے بھلا نہ سکا۔ ترکی اگر یورپ کا مردِ بیمار بنا تو مغربی طاقتوں کی سفارتی سازشوں کی وجہ سے۔ مگر ایک کمزور اور دُور اندیش سلطان کو "اطاعت پسندی" پر مجبور کرنے کے نتیجے میں محبِ وطن قوتوں میں نفرت کا لاوا ابل پڑا اور نوجوان ترکوں کی تاریخ نے جنم لیا۔ یہ بنیادی طور پر سیاسی اصلاحات کی تحریک تھی اور اس کی جڑیں ترکی کی تاریخی اور سیاسی روایات میں گہری تھیں۔ نوجوان ترک سپاہیوں اور سیاست دانوں پر مشتمل تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا، انور پاشا، عصمت پاشا، رؤف پاشا اور طلعت پاشا سپاہی بھی تھے اور سیاست دان بھی۔ کیونکہ ترکی گزشتہ پانچ صدیوں سے جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک محوری طاقت کی حیثیت سے ترکی نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ ساتھ شکست تسلیم کی مگر مصطفیٰ کمال پاشا کی ولولہ انگیز رہنمائی میں ترکی نے اس شکست کو فتح میں بدل دیا۔ مصطفیٰ کمال کی دلیرانہ قیادت میں ترکی نے شکست خوردہ اور ٹکڑے ٹکڑے قوم کو متحد کیا اور فرانس و برطانیہ کے حلیف یونان کو شکست فاش دی۔ غیر ملکیوں کو ترکی کی سرزمین سے نکالنے کے بعد اس عظیم سپاہی قوم کے سپاہی رہنما نے فوجی وردی اُتار پھینکی۔ اس نے ترکی کو ایک آئین دیا اور ایک پارلیمینٹ دی۔ ترکی کو ایک جدید ملک بنایا اور عورتوں کو آزادی دلوائی۔ اتاترک نے پہلے ایک پارٹی کی ریاست تشکیل دی اور اس زمانے میں ملی جلی معیشت کا نظام اختیار کیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے ملک میں جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لئے اپوزیشن پارٹی کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگِ انونو کے ہیرو عصمت پاشا کو فوجی ذمہ داریاں چھوڑ کر مکمل طور پر سیاست میں آنے پر آمادہ کیا اور اسے وزیر اعظم اور پیپلز ری پبلکن پارٹی کا سربراہ بنا دیا۔ انہوں نے ماہرِ اقتصادیات اور بینکر جلال بایار کو ڈیمو کریٹک پارٹی کا صدر بنانے کی حوصلہ افزائی اور حمایت کی۔ یہ درُست ہے کہ تاریخی وجوہات، قابلِ فخر اسباب اور شاندار کامیابیوں کی وجہ

سے ترکی کے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں فوجی روایات گھل مل رہی ہیں۔ مگر اگر اتاترک زندہ رہتے یا ان کی صحت اجازت دیتی تو وہ ترکی کی سیاست سے فوجی اثرات کو مکمل طور پر ختم کر کے دم لیتے"۔

"جب اتاترک کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے پیچھے ایک جمہوری ترکیہ کا نو عمر بچہ چھوڑا۔ جمہوریت کے اس نازک پودے نے بہت سرد گرم دیکھا ہے۔ دس سالہ دور اقتدار کے بعد 1950ء میں ری پبلکن پارٹی کو ڈیمو کریٹک پارٹی کے ہاتھوں شکست ہوئی اور جلال بایار صدر اور عدنان میندریس وزیر اعظم بنے اور پھر مئی 1960ء میں فوجی جرنیلوں نے نقب لگائی اور فوجی انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ترکی خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا تھا اور وہ مداخلت پر مجبور ہو گئے تھے۔ ڈیمو کریٹک پارٹی کے رہنماؤں کو یسیاڈہ کے جزیرے میں قید کر دیا گیا اور رسوائے زمانہ "یسیاڈہ مقدمات" کا سلسلہ شروع ہوا۔ وزیر اعظم میندریس' وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ کرے سیپشکن کو سزائے موت دی گئی"۔

"اس المناک اعلان کے فوراً بعد صدر ایوب خان نے مجھے اپنے خصوصی نمائندے کے طور پر انقرہ بھیجا تاکہ اس فیصلے پر عملدر آمد نہ کرنے کی اپیل کروں۔ میں انقرہ میں صدر جنرل گرسل سے ملا وزیر خارجہ سلیم سارپر بھی موجود تھے اور انہوں نے ترجمان کے فرائض سر انجام دیئے۔ گفتگو بڑی جاندار تھی۔ جنرل گرسل نے مجھے بتایا کہ سزائے موت پر عملدر آمد سے ترکی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں نے حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہوئے سختی کے ساتھ انہیں ٹوکا "جنابِ صدر! مسائل تو ان سزاؤں کے بعد شروع ہوں گے۔ جب میں ایوانِ صدر سے رخصت ہوا تو سلیم سارپر میرے ساتھ تھے ...... "خدا رحم کرے" یہ ان کا الوداعی جملہ تھا"

"آج ترکی جس شدید اور پریشان کن تقسیم سے دوچار ہے اس کی جڑیں پھانسیوں کے اس عاقبت نا اندیشانہ فیصلہ میں ہیں۔ ترکی کی مسلح افواج جان چکی ہیں کہ تضادات کا عمل سیاسی نوعیت کا ہے اور سیاسی ارتقاء ہی سے کسی توازن یا سمجھوتے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ سیاست کے میدان کے باہر سے کسی براہ راست یا گھٹیا مداخلت کے ذریعے حالات مزید بگڑیں گے"۔

"ہر ملک میں سیاسی افراتفری اور اضطراب کے لمحے آتے ہیں۔ برطانیہ میں ٹریڈ یونینوں کو متوازی حکومت کہا جاتا ہے مگر ان سے نمٹنے کے لئے کبھی فوج کی مداخلت کا سوچا بھی نہیں گیا نہ ہی برطانوی فوج نے 1931ء کی عام ہڑتال کے دوران عنانِ حکومت سنبھالی' جب پورا ملک مفلوج ہو گیا تھا۔ 31-1930ء کے "عظیم بحران" کے زمانے میں امریکی نظام تقریباً

منہدم ہو گیا تھا مگر امریکہ کی مسلح افواج نے سیاسی اقتدار پر قبضہ نہیں کیا۔ اگر فوجی حکومت کے لئے پاکستانی فوجی بغاوتوں والا جواز استعمال کیا جائے تو ساری دنیا پر جرنیل راج کا تسلط ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر 5 جولائی 1977ء کو اٹلی کی فوج کے چیف آف سٹاف روم ٹیلی ویژن پر نمودار ہوتے اور بائبل سے ایک اقتباس پڑھنے کے بعد عوام کو مطلع کرتے کہ وہ مداخلت پر مجبور ہو گئے ہیں تو ان کے الفاظ میں زیادہ وزن ہوتا مگر اٹلی میں ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو گا کیونکہ اس کا مطلب اٹلی اور اس کے اتحاد کا خاتمہ ہو گا"۔

"فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کسی اشتعال، حوصلہ افزائی یا بحران کی ضرورت نہیں ہوتی جب بھی ایسا ہوا ہے۔ بحران حل ہونے کی بجائے شدید تر ہی ہوئے ہیں۔ بحران نئے سرے سے اور نئی طاقت کے ساتھ لوٹ کر آتے ہیں۔ اگر یکم جنوری 1978ء کو راولپنڈی پریس کانفرنس میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا یہ دعویٰ درست ہے کہ "سیاسی مسائل سیاسی طریقوں ہی سے حل کئے جا سکتے ہیں" تو انہیں یہ بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ "سیاسی مسائل سیاست دان ہی حل کیا کرتے ہیں"
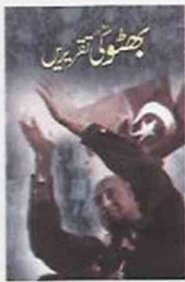
قیمت: 185روپے
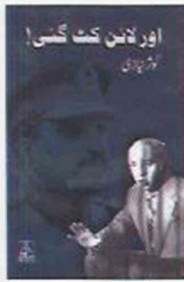
قیمت: 280روپے
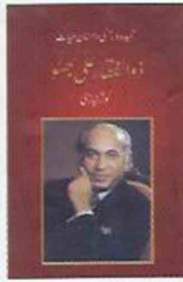
قیمت: 250روپے

قیمت: 250روپے
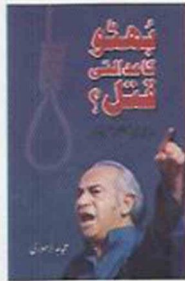
قیمت: 220روپے
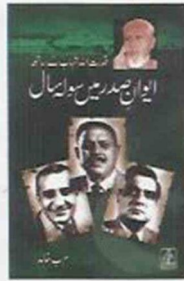
قیمت: 290روپے

قیمت: 295روپے
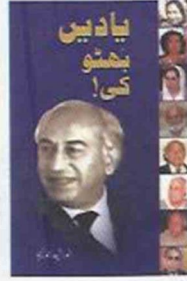
قیمت: 250روپے
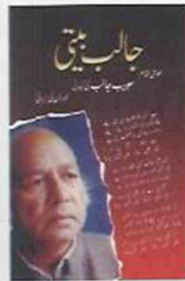
قیمت: 350روپے
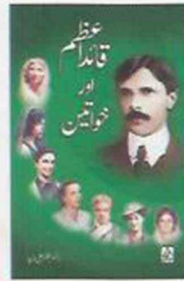
قیمت: 300روپے
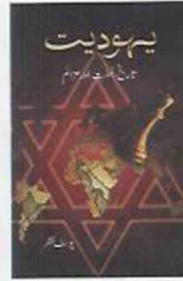
قیمت: 300روپے
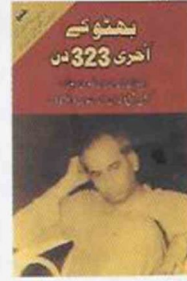
قیمت: 250روپے

ISBN 978-969-9225-08-6

احمد پبلی کیشنز لاہور
ملک بلڈنگ نمبر 1، A-19، ایبٹ روڈ، لاہور۔
فون:042-36307828 فیکس:042-36314383
ای میل:ghalibooks@yahoo.com